راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیر اہتمام مسلسل اشاعت کا ۱۵واں سال

ماہنامہ

ارژنگ

لاہور

Monthly

Arxang

Lahore

۲۰۱۳ء

جلد ۱۵ شمارہ ۵

مدیر اعلیٰ: عامر بن علی

مدیر: حسن عباسی

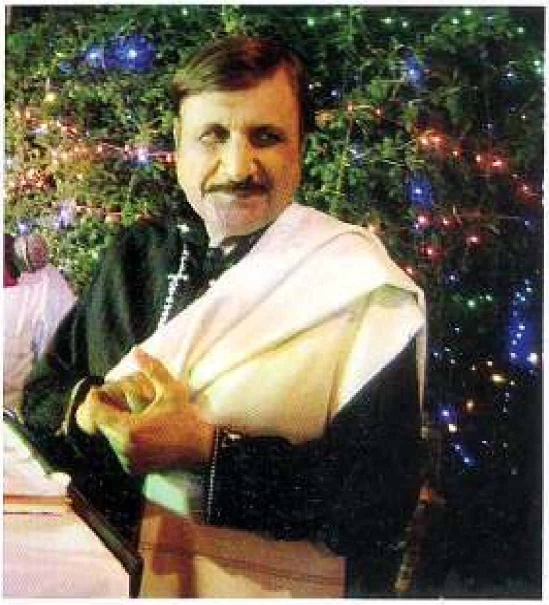

ڈاکٹر انعام الحق جاوید سے عامر بن علی اور ابرار ندیم کی خصوصی گفتگو

سنجیدہ شاعر اپنی شاعری میں محبوبہ کے اردگرد جبکہ مزاحیہ شاعر منکوحہ کے اردگرد دکھائی دیتا ہے۔ ڈاکٹر انعام الحق جاوید

ارژنگ: آپ نے سنجیدہ شاعری بھی کی لیکن اس میں آپ کو وہ شہرت و کامیابی نہ مل سکی جو بطور مزاحیہ شاعر کے ہے؟

ڈاکٹر انعام الحق جاوید: اگر اس سوال سے آپ کی مراد یہ ہے کہ میں اپنی سنجیدہ شاعری سے مایوس ہو کر شعوری طور پر ادھر آیا تو شاید یہ الزام درست نہیں کیونکہ مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ میں نے فنون جیسے وقیع ادبی جریدے سے چھپنے کا آغاز کیا اور یہ گزشتہ صدی کے ساتویں دہائی کے وسط کی بات ہے آج کی بات نہیں جب سینکڑوں ادبی پرچے ادبی رزق کی تلاش میں ادیبوں سے ان کی تخلیقات کا تقاضا کر رہے ہیں۔ اسی طرح اس وقت بھی دوسرے شہروں میں ملفوف مشاعرے پڑھا کرتا تھا اور اپنی سنجیدہ شاعری سے مطمئن تھا لیکن ساتھ ہی کہیں ایک مزاح نگار بھی کسی کونے کھدرے میں چھپا بیٹھا تھا۔ ڈرا ہوا، سہا ہوا اور چپ چاپ اندر ہی اندر منمناتا ہوا۔ پھر جب میں اسلام آباد آیا اور یہاں جنرل شفیق الرحمٰن، سید ضمیر جعفری، سرفراز شاہد اور انور مسعود کی رفاقت میسر آئی تو اس مزاح نگار نے سر اٹھانا شروع کر دیا اور جب اسے تھاپڑا ملا تو یہ اور شیر ہو گیا۔ لاہور میں بھی مجھے عطاء الحق قاسمی جیسے صاحب طرز مزاح نگار کی قربت حاصل رہی بلکہ یوں سمجھئے کہ انہوں نے ہی ایک بڑے بھائی کی حیثیت سے میری ساری ٹریننگ کی اور میں آج جو کچھ ہوں انہی کے طفیل ہوں۔ عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ سنجیدہ شاعری کا اپنا مقام ہے مزاحیہ شاعری کا اپنا تاہم یہ درست ہے کہ جو شہرت مجھے شاعری کے باعث حاصل ہوئی وہ شاید سنجیدہ شاعری سے نہ ملتی کیونکہ ایک لاکھ چوبیس ہزار شعراء میں اپنا الگ اور منفرد مقام بنانا آسان کام نہیں۔

ارژنگ: مزاحیہ شاعری کی ادبی حیثیت کی ہے؟

ڈاکٹر انعام الحق جاوید: مزاحیہ شاعری کی ادبی حیثیت وہی ہے جو ادب میں شاعری کی ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص سنجیدہ شاعری کر رہا ہے کوئی قومی شاعری کر رہا ہے کوئی مذہبی شاعری کر رہا ہے کوئی موضوعاتی شاعری کرتا ہے اور کوئی مزاحیہ شاعری کر رہا ہے۔ مزاح دراصل بات کرنے کا ایک انداز ہے۔ موضوعات تو مزاح کے بھی وہی ہیں جو سنجیدہ کے ہیں بس ان موضوعات کی ٹریٹ منٹ اور انہیں استعمال کرنے کا انداز مختلف ہے۔ دونوں طرح کے شاعر ملا محتسب، دوغلے پن، ظاہرداری، ظلم، زیادتی، معاشرتی تفاوت، امیر و غریب کے فرق اور طبقاتی تفریق کو طنز و تنقید کا نشانہ بناتے ہیں اور اس پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے ایک ایسے خوشحال معاشرے کا خواب دیکھتے ہیں اور دکھاتے ہیں جو مساوات اور عدل پر مبنی ہو۔ دونوں طرح کے شاعر لطیف جذبات کے ابھار کے لیے معاملات من و تو بیان کرتے اور وصل و فراق کے رونے روتے ہیں بس اس فرق کے ساتھ کہ سنجیدہ شاعر اپنی شاعری میں محبوبہ کے اردگرد جب کہ مزاحیہ شاعر منکوحہ کے اردگرد دکھائی دیتا ہے۔

ارژنگ: ہمعصر مزاحیہ شاعروں میں کون سے پسند ہیں؟

ڈاکٹر انعام الحق جاوید: حاضر سروس شعراء میں سے انور مسعود، امیر اسلام ہاشمی، سرفراز شاہد، اطہر شاہ جیدی، ضیاء الحق قاسمی، خالد مسعود اور زاہد فخری خاص طور پر پسند ہیں کہ یہ لوگ اپنی اپنی جگہ مزاحیہ شاعری کو نئے آہنگ اور نئے رنگ سے روشناس کرا رہے ہیں۔ وفات شدگان میں سے سید ضمیر جعفری نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ یعنی اردو کی مزاحیہ شاعری میں سلسلہ ضمیر یہ اور پنجابی کی مزاحیہ شاعری میں سلسلہ مسعودیہ سے تعلق رکھتا ہوں۔

بقیہ صفحہ نمبر

"...... اور مت پردہ پوشی کرو سچ کی جھوٹ سے نہ چھپاؤ سچائی کو جب تم جانتے ہو۔" (القرآن)

MONTHLY ARXANG LAHORE.

ماہنامہ ارژنگ لاہور

جلد نمبر 15 مہینہ مئی 2013ء شمارہ نمبر ۴

مدیر اعلیٰ: عامر بن علی مدیر: حسن عباسی

مدیران اعزازی: ڈاکٹر صغرا صدف، ابرار ندیم، شازیہ نورین

نائب مدیر: زبیر بشیر معاون مدیر: علی رضا، کامران ندیم

قانونی مشیر: ناصر علی 0322-4702353

قیمت فی شمارہ 60 روپے زر سالانہ مع ڈاک خرچ 1000 روپے

پتا برائے خط و کتابت

ماہنامہ ارژنگ

F-3 الفیروز سنٹر غزنی اسٹریٹ

اُردو بازار، لاہور 0300-4489310

nastalique786@gmail.com

سالانہ ممبر شپ مع ڈاک خرچ (پاکستان) 1000 روپے

سالانہ ممبر شپ مع ڈاک خرچ (برائے بیرون ملک پاکستان) 5000 روپے

رابطہ 0331-4489310 0300-4489310

حسن ترتیب

اداریہ ' ۲

حمدیہ کلام ' محمد ریاض الدین سہروردی ' ۳

نعتیہ کلام: علی رضا، عبدالسلام شمر ' ۴ تا ۵

مضامین:

x افتخار مجاز...... میرا دوست / پروفیسر جمیل احمد عدیل ' ۶

x اساطیری لہجے کا جمالیاتی شاعر / سلیم شہزاد ' ۸

افسانے:

x بدن دریدہ / پروین عاطف ' ۱۲

x تیز قدم / نیلم احمد بشیر ' ۱۸

x تیسرا روز / شاہد جمیل ' ۲۰

x ٹرانسفر / شعیب صادق ' ۲۲

x محبت / راحت وفا ' ۲۵

متفرق شاعری: ۲۷ تا ۲۹

شعری گوشے: ظفر اقبال، عطاء الحق قاسمی، نجیب احمد، باقی احمد پوری، فرخ راجا، ارشد نعیم، ڈاکٹر ضیاء الحسن، حمیدہ شاہین، شاہد ذکی، سہیل ثاقب، افضل خان، واصف سجاد، سید انوار احمد ڈاکٹر، مختار جاوید، سرور ارمان، عمران شناور علی نقوی، فاخر رضوی، ۳۰ تا ۴۷

ادبی خبریں ' ۴۸

متفرق شاعری: ۵۰ تا ۵۱

تبصرہ کتب ' ۵۲

خطوط ' ۵۵

ارژنگ دوست بیرون ملک

- امریکہ، شکیل سروش
- ابوظہبی، طارق بٹ
- کینیڈا، شعیب صادق
- ڈنمارک، صفدر علی آغا
- بحرین، اقبال طارق
- کویت، صفدر علی صفدر
- اسپین، نذیر اے قمر
- العین، سعید پسروری
- دوحہ، قیصر مسعود
- یوکے، سعدیہ سیٹھی
- فرانس، اسد رضوی
- سعودی عرب، اسلم کمان
- ناروے، ارشد شاہین
- آسٹریلیا، ظفر اسلام
- دبئی، سلمان جاذب
- شارجہ، نوید انور
- سویڈن، عابدہ سیال

Far East Marketing Co.
Samaria Mansion 605 Koenji-Minami 1-6-5,
Suginami-Ku, Tokyo, 166-0003, Japan
E-mail: femc1@hotmail.com

عامر حسین پبلشر نے زاہد بشیر پریس ریٹی گن روڈ سے چھپوا کر اردو بازار لاہور سے شائع کیا

کتاب سے محبت کا دن

اداریہ

نامور افسانہ نویس اور ناول نگار مظہر الاسلام جب سے نیشنل بک فاؤنڈیشن کے ایم ڈی بنے ہیں یوں لگتا ہے جیسے اس ادارے میں موسم بہار اُتر آیا ہے۔ کتاب اور صاحب کتاب کو معتبر بنانے کے لیے انھوں نے جو اقدام کیے وہ ناقابل فراموش ہیں۔ ''کتاب کا قومی دن'' منایا جانا اس حوالے سے اُن کا بڑا کارنامہ ہے۔ گزشتہ برس کی طرح اس بار بھی ۲۰ تا ۲۱ اپریل کتاب لکھنے اور پڑھنے والوں کے لیے جشن کے طور پر منایا گیا۔ کتاب کے قومی دن کو اس بار کتاب سے محبت کا دن یعنی Books Valentine's day قرار دیا گیا۔ اس جشن میں ملک بھر سے نامور ادیبوں کے ساتھ ساتھ نوجوان ادیبوں نے بھی شرکت کی۔ انتظار حسین، عطاء الحق قاسمی، مستنصر حسین تارڑ، امجد اسلام امجد، مسعود اشعر، اسد محمد خاں، نذیر ناجی، محمود شام، اصغر ندیم سیّد، احمد عقیل رُوبی، زاہدہ حنا، جاوید جبار، رضا ربانی، ڈاکٹر وحید احمد اور عاصم بٹ نے اپنی کتابوں سے اقتباسات پیش کیے۔ کتاب کی اہمیت، ضرورت اور پروجیکشن کے حوالے سے نیشنل بک فاؤنڈیشن کی ترتیب دی گئی سہ روزہ تقاریب بہت دلچسپ اور اہم تھیں۔ خاص کر بچوں کے حوالے سے تقاریب، جن میں مختلف اسکولوں کے طلباء وطالبات کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔ افتتاحی تقریب میں بچوں نے کتاب پریڈ کی اور کتاب کا ترانہ بھی پیش کیا۔ بچوں میں کتب بینی کے رُجحان کو پروان چڑھانا نہایت اہم امر ہے۔ لہٰذا اس کے لیے بہت سے پروگرام رکھے گئے جو کہ لائق صد تحسین ہیں۔ اس موقع پر بہت بڑے کتاب میلے کا بھی انعقاد کیا گیا جس میں سو سے زیادہ پبلشرز نے اسٹال لگائے۔

مظہر الاسلام اور نیشنل بک فاؤنڈیشن کی پوری ٹیم اس حوالے سے مبارک باد کی مستحق ہے۔ ہم اُن کی کاوشوں اور کوششوں کو سراہنے کے ساتھ ساتھ چند گزارشات بھی اُن کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں تاکہ مستقبل میں وہ ان کو ملحوظ خاطر رکھ کے اسے مزید بہتر بنا سکیں۔ پہلی گزارش تو یہ ہے کہ صبح دس بجے سے رات دس بجے تک بند کمرے میں بٹھا کر ادیبوں کو نثری اقتباسات نہ سنائے جائیں۔ دورانیہ کم ہونا چاہیے اور یکسانیت بھی نہ ہو۔ ۱۲ گھنٹے تک تو سینئر کیا نوجوان ادیبوں کے لیے بھی بیٹھنا محال ہو جاتا ہے۔ اتنا تو کلاس روم کا دورانیہ بھی نہیں ہوتا۔ دوسری گزارش یہ ہے کہ نوجوان ادیبوں والے سیشنز میں کسی سینئر ادیب نے شرکت نہیں کی اور نہ ہی ایم ڈی نیشنل بک فاؤنڈیشن نے انہیں اس قابل سمجھا۔ سو یہ صورتحال افسوس ناک ہے اور اس سے زیادہ افسوس ناک امر یہ ہے کہ ان اجلاسوں میں جو ادیب شیڈول تھے اور باہر کے شہروں سے آئے تھے، ان کا وقت غیر شیڈول مقامی ادیبوں کو دے دیا گیا جس کی وجہ سے شدید بدنظمی ہوئی اور مدعو ادیب اپنی تخلیقات پیش کرنے سے قاصر رہے۔ تیسری گزارش یہ ہے کہ اس بار حاضرین کی شرکت بھی بہت کم تھی۔ کالج اور یونیورسٹی کے طلباء وطالبات کی شرکت سے اس میں حقیقی طور پر جشن کا سماں پیدا ہو سکتا تھا۔ اُمید ہے مستقبل میں نیشنل بک فاؤنڈیشن ''کتاب کے دن'' کو مزید خوبصورتیوں اور بہتر انتظامات کے ساتھ منائے گی۔

حسن عباسی

محمد ریاض الدین سہروردی

ورد کرنا ترے نام کا دم بہ دم — اہلِ دل کی ہے خو، وحدہٗ وحدہٗ

حضرت علامہ مولانا سید محمد ریاض الدین سہروردیؒ ۱۴ اپریل ۱۹۱۹ء کو جے پور (انڈیا) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد محترم سے حاصل کی۔ بعد ازاں اسلامیہ ہائی اسکول امرتسر سے میٹرک کیا اور بزرگانِ دین، علماء کرام سے تفسیر، حدیث، فقہ و دیگر علوم و فنون حاصل کیے۔ عربی، فارسی اور دیگر زبانوں پر مکمل دسترس حاصل تھی۔ اللہ تعالیٰ نے نعت گوئی آپ کو ورثہ میں عطا فرمائی۔ آپ نے اپنی محنت سے نعت گوئی و نعت خوانی کو ایک تحریک کی شکل دی اور کروڑوں دلوں میں محبت رسولؐ کے چراغ روشن کیے۔ آپ نے بے شمار کتابیں لکھیں۔ کئی نعتیہ مجموعے بھی شائع ہوئے جن میں ریاضِ رسولؐ، دیوانِ ریاض، گلدستہ نعت قابل ذکر ہیں۔

تو طلب ہے میں ہوں طالب، میں کہاں اور تو کہاں
میں ہوں عاجز تو ہے غالب، میں کہاں اور تو کہاں
حاکم و محکوم میں کیسا نمایاں فرق ہے
میں غلام اور تو ہے صاحب، میں کہاں اور تو کہاں
خود تیرا فرمان ہے کہ تو ہے تواب الرحیم
میں تیرے در پہ ہوں تائب، میں کہاں اور تو کہاں
لم یلد ہے اور ولم یولد ہے تو اور میری اصل
ہے مگر صلب و ترائب، میں کہاں اور تو کہاں
تو نظر آتا نہیں محسوس ہوتا ہے مگر
کچھ نہیں ہے تجھ سے غائب، میں کہاں اور تو کہاں
ذرّے ذرّے کا تو خالق اور تو خود ہے قدیم
ہے ترا ہی قول صائب، میں کہاں اور تو کہاں
ورد اسم ذات کا اور ورد اسمائے صفات
یہ داروئے جملہ مصائب، میں کہاں اور تو کہاں
حمد تیری تیرے لائق کر نہیں سکتا ریاضؔ
ہے یہی کہنا مناسب، میں کہاں اور تو کہاں

ذرے ذرے میں تو وحدہٗ وحدہٗ
ہے صدا چار سو وحدہٗ وحدہٗ
ساری مخلوق کے لب پہ ہے رات دن
تیری ہی گفتگو وحدہٗ وحدہٗ
ہوتے دیکھے ہیں آخر سرِ پُرغرور
خم ترے رُو بہ رُو وحدہٗ وحدہٗ
تیرے ڈر سے جو روتی ہے اُس آنکھ کا
ہو گیا ہے وضو وحدہٗ وحدہٗ
ورد کرنا تیرے نام کا دم بہ دم
اہل دل کی ہے خو وحدہٗ وحدہٗ
سارے عطروں میں بھی سارے پھولوں میں بھی
ہے تیری رنگ و بو وحدہٗ وحدہٗ
تیری قدرت کی آئیں نظر جھلکیاں
سُو بہ سُو کُو بہ کُو وحدہٗ وحدہٗ
بلبلیں قمریاں ذکر تیرا کریں
یہ ہے کوئل کی کو وحدہٗ وحدہٗ
صورتِ مصطفیٰ میں ہوا جلوہ گر
خود ہی تُو ہُو بہ ہُو وحدہٗ وحدہٗ
جاؤں دنیا سے جب ہو لبوں پہ ریاضؔ
اللہ ہو اللہ ہو وحدہٗ وحدہٗ

رہے جو وردِ زباں لا الٰہ الا اللہ
بنے حصارِ اماں لا الٰہ الا اللہ
اساسِ دین متیں ہے عقیدۂ توحید
وجودِ حق کا نشاں لا الٰہ الا اللہ
خدا کے سارے رسولوں نے ہر زمانے میں
یہی کیا ہے بیاں لا الٰہ الا اللہ
یہی وظیفہ ہے جن و ملک کا صبح و مسا
پڑھیں ہیں پیرو جواں لا الٰہ الا اللہ
چمک دمک میں مثالی ہے روشنی اس کی
دلوں میں گو ہے نہاں لا الٰہ الا اللہ
اسی کے نور نے دُنیا کو جگمگا ڈالا
ضیائے کون و مکاں لا الٰہ الا اللہ
کسی پہ اس کی حقیقت کا راز کھل نہ سکا
ورائے وہم و گماں لا الٰہ الا اللہ
کوئی بتائے محمدؐ کے بعد دُنیا میں
کہا گیا نہ کہاں لا الٰہ الا اللہ
سنایا نغمہ توحید جب نبیؐ نے ریاضؔ
پکار اُٹھا جہاں لا الٰہ الا اللہ

سزاوار ثنا ہے ذاتِ باری
ہے جس کا ہر زباں پر نام جاری
حضور اس کے ملائک سرنگوں ہیں
شہنشاہوں پہ اس کا خوف طاری
حکومت اس کی ہے ارض و سما میں
ہے تابع اس کی یہ مخلوق ساری
اُسی شان میں رطب اللساں ہے
یہ خاکی اور یہ نوری اور یہ ناری
پیمبر اس کے واصف ترجماں ہیں
اسی کے عالم و درویش و قاری
ریاضِ خلد ہے اس کا ٹھکانہ
خدا کی جس کو ہے توحید پیاری

علی رضا
ساہی وال

اعزاز نہیں اس سے بڑا کوئی جہاں میں　　　اُس گنبدِ خضریٰ کی زیارت کے علاوہ

جیسے ہر مسلمان دل کی آرزو ہے کہ وہ دیارِ مقدس کی زیارت کرے تو ویسے ہی ہر مسلمان کی یہ بھی ازلی دیرینہ اور شدت سے خواہش رہتی ہے کہ وہ بحضور سرورِ کائنات ﷺ کے ان کی تعریف و توصیف بھی کرے۔ ایسے اظہار کے لیے ایک ذریعہ نعت گوئی بھی ہے۔ جہاں صدیوں سے نعت گوئی کا سلسلہ جاری و ساری ہے۔ وہاں علی رضا صاحب بھی اپنی عقیدت کا اظہار اپنی شاعری سے کرتے ہیں۔ ان کا ایک یہ بھی خاصہ ہے کہ وہ گلہائے عقیدت آقائے دو جہاں کے حضور ترنم کے ساتھ نچھاور کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ انہیں ترنم کے ساتھ لذت و سرور حاصل ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ عشقِ نبی ﷺ کی تعریف میں اس قدر محو ہو جاتے ہیں کہ انہیں گرد و پیش کی خبر نہیں ہوتی۔ کئی بار تقریب کے ناظم کو چونکانا پڑتا ہے۔ سبحان اللہ کیا عشقِ رسول کی مثال ہے۔ یہاں آپ بھی پڑھ کر یقیناً دل کی گہرائیوں سے عشقِ نبی میں ڈوب کر لکھی جانے والی نعتیں پڑھ کر حضور ﷺ کی نیازمندی حاصل کریں گے۔ اپنے قارئین کو بتاتا چلوں کہ علی رضا مسلسل ۱۰ مرتبہ قومی سیرت کانفرنس میں نعت خوانی کا اعزاز حاصل کرنے کے علاوہ وزیر اعظم کی طرف سے حج بیت اللہ شریف بھی کر چکے ہیں اور عنقریب ان کی لکھی ہوئی نعتوں کا مجموعہ بھی جو زیرِ طباعت ہے جلد ہی پڑھنے کو ملے گا۔ نازاد کاڑوی

درِ نبیؐ جو مجھے دور سے دکھائی دیا
پھر اُس کے بعد تو کچھ بھی نہیں سجھائی دیا
کچھ ایسا فیض رساں ہے حضور کا دربار
کسی کو بھی نہ کبھی دردِ نارسائی دیا
اذانِ مسجدِ نبوی کا سوز کیا کہیے
یہ سوز مجھ کو بڑی دور تک سنائی دیا
ذرا سی دیر میں جلوہ گہِ حضورؐ میں تھا
ذرا سی دیر میں کیا کیا مجھے دکھائی دیا
مرے حضورؐ کی مدحت کے فیض نے مجھ کو
سخن کے باب میں احساسِ پارسائی دیا
اُسی کی نعت میں ہو زندگی تمام مری
وہ جس نے مجھ کو شعورِ سخن سرائی دیا
مرے نبیؐ نے شفاعت کا مجھ سے عاصی کو
جہاں میں رہتے ہوئے مژدۂ رہائی دیا
خدائے ارض و سما کا کرم ہے جس نے رضاؔ
نبیؐ کے در پہ مجھے منصبِ گدائی دیا

مجھے ہر قدم ملی آبرو تری نعت سے
میں کہ منزلوں میں ہوں سرخرو تری نعت سے
تری مدح میں یہ قلم رواں ہوا جب کبھی
مرے لفظ ہو گئے خوبرو تری نعت سے
ترے شہر نے مجھے روشنی کا پتا دیا
ملا مجھ کو عالمِ رنگ و بو تری نعت سے
تری نعت نے وہ عروج بخشا خیال کو
مری شہرتیں ہوئیں کو بہ کو تری نعت سے
ترے عشق نے یہ گداز دل کو عطا کیا
مرے شوق کی جو ہوئی نمو تری نعت سے
تری خوشبوؤں میں بسے ہوئے ترے شہر کی
بڑھی اور دیر کی جستجو تری نعت سے
ترے عشق نے مری زندگی کو بدل دیا
مرے قلب و جاں ہوئے مشکبو تری نعت سے
وہ جمالِ غارِ حرا میں جو ہوا ضَو فگن
کبھی ہو رضاؔ کے بھی روبرو تری نعت سے

خوشبو ہے اُجالا ہے درِ سیدِ والاؐ
ہر رُخ سے نرالا ہے درِ سیدِ والاؐ
ہے میری جبیں کو بھی تو نسبت اُسی در سے
میرا بھی حوالہ ہے درِ سیدِ والاؐ
اس قریۂ پرنور میں ظلمت نہیں ہوتی
اک نور کا ہالہ ہے درِ سیدِ والاؐ
دنیا میں حسیں اس سا نہیں ہے کوئی منظر
ہر چیز سے اعلیٰ ہے درِ سیدِ والاؐ
شان اُس کی رضاؔ ہم سے بیاں ہو نہیں سکتی
ادراک سے بالا ہے درِ سیدِ والاؐ

سرکارِ مدینہ کی محبت کے علاوہ
دل میں نہیں کچھ طیبہ کی چاہت کے علاوہ
اعزاز نہیں اس سے بڑا کوئی جہاں میں
اُس گنبدِ خضریٰ کی زیارت کے علاوہ
اے کاش کہ اب زندہ رہوں جتنا بھی مجھ کو
کچھ کام نہ ہو اُن کی اطاعت کے علاوہ
درکار نہیں کچھ بھی فقط، اب تو جہاں میں
مجھ کو مرے آقاؐ کی عنایت کے علاوہ
آقاؐ ہی سے اس بات کا ادراک ملا ہے
کچھ بھی نہیں کردار کی عظمت کے علاوہ
جب حشر میں پہنچوں گا تو آقاؐ سے کہوں گا
کچھ پاس نہیں آپ کی مدحت کے علاوہ

آپؐ کی ذات روشنی، آپؐ کا نام روشنی
آپؐ جمالِ کبریا، آپؐ تمام روشنی
آپؐ کے حسنِ خلق سے ایک جہاں ہے فیضیاب
آپؐ کی زندگی کا ہے سارا نظام روشنی
آپؐ کا لطف مجھ کو بھی خوب عطا ہوا حضورؐ
مل گئی مجھ کو آپؐ کے در پہ تمام روشنی
جن کے لیے یہ مہر و ماہ خلق کیے گئے رضاؔ
اُن کی رہے گی تا ابد بن کے غلام روشنی

عبدالسلام ثمر / بہاولپور

زادِ راہ مدینہ ہوں گے یہی   آنسوؤں کو سنبھال رکھتے ہیں

محمد عبدالسلام ثمر پر رب کا کرم ہے اس لیے اسے مدحِ رسول صلعم لکھنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ لفظوں میں عقیدت کے پھول نچھاور کرنے کا شرف ملا ہے۔ اب وہ قبولیت کی خاطر آنکھوں میں آنسو لیے سرکار صلعم کے دربار حاضر ہوا ہے اور یہ وہ دربار ہے جہاں سے آج تک کوئی خالی نہیں لوٹا۔ عبدالسلام ثمر کی نعت گوئی کا کمال یہ ہے کہ فنی دسترس اور جذبہ عقیدت اس طرح آپس میں گھل مل گئے ہیں کہ کہیں بھی تصنع کا گمان نہیں ہوتا اور بعض مقامات پر نعت پڑھتے ہوئے قاری پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ ثمر صاحب مطالعہ میں نعت کی روایت اور جدت سے بخوبی آگاہ ہیں۔ مگر نعتیہ کلام میں تاثیر تو دیوانگی، عاشقی اور وارفتگی سے آیا کرتی ہے۔ جو کہ ان کے کلام میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ (عطاء الحق قاسمی)

میں مدینے اگر گیا ہوتا
تو مقدر سنور گیا ہوتا
جاودانی حیات مل جاتی
گر مدینے میں مر گیا ہوتا
کچھ درود و سلام کے گجرے
لے کے زادِ سفر گیا ہوتا
پھول ہوتا گلاب کا اے کاش
تیری رہ میں بکھر گیا ہوتا
دیکھ لیتا جو ایک بار تجھے
پھر میں جاں سے گزر گیا ہوتا
دیکھتا جا کے سبز گنبد کو
نقش دل میں اُتر گیا ہوتا
آسرا مل گیا ترا ورنہ
میں تو مدت کا مر گیا ہوتا
درِ اقدس پہ میں جو ہوتا ثمر
میرا دامن بھی بھر گیا ہوتا

پاتے ہیں سکوں جا کر انسان مدینے میں
رہتے ہیں رسولوں کے سلطان مدینے میں
مائل بہ کرم رہتے ہیں شاہِ عرب ہر دم
ہو جاتے ہیں پورے سب ارمان مدینے میں

فرقت کا جو وقت آیا دل ساتھ نہیں آیا
چھوڑ آیا ہوں اپنا میں سامان مدینے میں
بے ٹوک چلے آؤ جو مانگنا چاہو تم
جاری ہے محمدؐ کا فیضان مدینے میں
اپنی جنہیں رحمت سے سرکارؐ بلاتے ہیں
بنتے ہیں وہی جا کر مہمان مدینے میں
سرکار کریں شاید اک نعت کی فرمائش
لے جاؤں گا ساتھ اپنے دیوان مدینے میں
پلکوں پہ سجا لوں میں خاکِ درِ اقدس کو
رہنا جو میسر ہو اک آن مدینے میں

ان کی جانب خیال رکھتے ہیں
ہم بھی سوزِ بلالؓ رکھتے ہیں
ان سے ہی گوہرِ مراد ملا
گدڑیوں میں جو لعل رکھتے ہیں
ماہِ طیبہ کا جلوہ ہے درکار
کیسا ذوقِ جمال رکھتے ہیں
جسے اللہ نے چنا محبوب
دلبر خوش خصال رکھتے ہیں
ان کی نعلین پاک ہے سر پر
تاج کیا باکمال رکھتے ہیں

زادِ راہ مدینہ ہوں گے یہی
آنسوؤں کو سنبھال رکھتے ہیں
آستانِ رسولؐ کے ذرے
روشنی لازوال رکھتے ہیں
ان کے در پر کسی طرح پہنچیں
آرزوئے وصال رکھتے ہیں
پاس حسنِ عمل تو کوئی نہیں
حبِ اصحابؓ و آلؑ رکھتے ہیں

دل و دماغ میں صدا حضورؐ کا خیال ہے
زباں پہ ہر گھڑی حضور ہی کی قیل و قال ہے
تمام خلق سے بنایا حق نے آپ کو نہیں
تمام خلق میں نمایاں آپ کا جمال ہے
جمالِ مصطفیٰؐ سے ہے زمانے بھر کی روشنی
جمالِ مصطفیٰؐ خدا کا مظہرِ جمال ہے
نقوشِ پائے مصطفیٰؐ ہیں راہِ حق کے رہنما
جو ان کی راہ پر چلا اویسؓ ہے بلالؓ ہے
محبتِ نبیؐ اگر نہ ہو تو محض ہے فنا
اگر ہو عشقِ مصطفیٰؐ تو زیست لازوال ہے

افتخار مجاز...... میرا دوست

پروفیسر جمیل احمد عدیل

افتخار مجاز سے تعارف پر دو دہائیاں بیت چکی ہیں اور اس دوران میں پانی اپنے مخصوص دستور کے مطابق پلوں کے نیچے مسلسل بہتا رہا ہے۔ نتیجہ معلوم ہم دونوں مل کر ایک صدی پر محیط ہو چکے ہیں یعنی میں پچاس سے جتنا کم ہوں، یہ اتنا زیادہ ہوں گے۔ سرد و گرم چشیدہ، ہر طرح کے ابر و باراں دیدہ، پختگی کو چہروں پر نقش کیے ہوئے اپنے اپنے مدار میں گردشِ مدام میں منہمک..... لیکن مذکورہ Orbits کے کنارے جس سرحد پر ایک دوسرے کو کبھی کبھار چھوتے ہیں اسے ''حدِ ادب'' ہی کہا سکتا ہے۔ لٹریچر کی لطافت نے افتخار مجاز کی شخصیت میں جس کو ملتا کو فروغ دیا ہے، میں اسی ملائمت کا دل سے مفتوں ہوں۔ بس کا صاحبو! یہی میری ''ادب'' سے وابستگی ہے۔ باقی رہا پڑھنا اور لکھنا تو خبر نہیں، وہ مشقِ سخن ہے یا چکی کی مشقت بہر صورت جاری ہے کہ کم از کم ''مجھے تو اور کوئی کام بھی نہیں آتا''

اب سوچتا ہوں کہ اس ''کام'' پر لگانے والے کون تھے؟ تو جن دو چار اصحاب کے مہربان نقوش تصور میں اُبھرتے ہیں ان میں یقیناً افتخار مجاز کا نام شامل ہے۔ مجھے بہت اچھی طرح یاد ہے کہ یہ پہلے دوست ہیں جنہوں نے نہ صرف اپنے ایک کالم میں راقم کو شاباش دی بلکہ اس اخبار کا تراشا بھی ارسال کیا جسے میں اور اے غفار پاشا، جانے کتنے ہی دن پڑھتے رہے۔ درحقیقت ہمیں یقین ہی نہیں آتا تھا کہ کوئی ہمارے اَدبی جرِیدے کو اس سطح پر بھی سراہ سکتا ہے۔ ابتدائی زمانے میں میسر آنے والی حوصلہ افزائی کیا کام کر جاتی ہے، کیا عرض کیا جائے!! شاید اس لیے کہ اس وقت ہر سینئر ہمت شکنی کے عمل کو اپنا فرضِ منصبی سمجھتے ہوئے Snubbing میں اپنی بقا ڈھونڈتا ہے۔ پھر ادب کا معاملہ تو اس درجہ لطیف ہے کہ اس مرغزار کی اور نکلتا ہی وہ ہے، جو خلقی کسی مسئلے کے ساتھ دنیا میں آیا ہے۔ سو آج جب پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو افتخار مجاز کو اپنے محسن کے شفیق روپ میں محسوس کرتا ہوں۔

۲۰۰۰ء میں جب ''زہاب'' دوبارہ شروع کرنا چاہا تو افتخار مجاز کو اپنے ساتھ کھڑا پایا۔ اُن دنوں ہمارا یہ ''بازوئے شمشیر زن'' غالباً موٹر سائیکل کے ایک حادثے کے سبب دائیں ہاتھ کو حرکت دینے سے قاصر تھا، وگرنہ فوری کمک فراہم کرنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے، سچ ہے بازو ٹوٹے باز کو بازی لقمہ دے..... اب اس واقعے پر کوئی بارہ برس گزر چکے ہیں، مگر مجھے اپنے اس حبیب کے مکتوب کی سطریں بھولتی ہی نہیں ہیں:

''پرچہ اور گرامی نامہ ایک ساتھ موصول ہوئے۔ بخدا! فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا ہے کہ خط زیادہ خوب صورت ہے یا زہاب؟ تو عرض ہے کہ اپنے ہاتھ سے نہ لکھ سکنے کا پہلی بار ملال، آپ اور جناب حنیف صوفی کی یہ تخلیق دیکھ کر ہوا ہے۔ پلستر کھلنے کا Count down جاری ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے نوید دی ہے کہ ہفتہ عشرہ میں آپ خود لکھنے کے اہل ہو سکیں گے۔ لہٰذا فی الوقت ان سطور کو میری جانب سے رسید جانیے'' (واضح رہے افتخار صاحب نے یہ خط اپنی بیٹی کو Dictate کرایا تھا۔)

اس کے بعد افتخار مجاز نے اپنی دو فکاہیہ تحریریں مجلّے کے لیے مجھے بھجوائیں:

ماڈرن طوطا کہانی، بولیے جواب دیجیے

اور میں مخمصے میں پڑ گیا کہ ان میں سے کسی ایک کا تازہ اشاعت کے لیے انتخاب کروں؟ اور یہ عاجز کہ ٹھہرا دونوں مٹھیوں میں لڈو رکھنے والا پرانا پاپی! سو'' کلام نرم و نازک'' کے تحت دونوں لذیذ آرٹیکلز ایک ساتھ چھاپ دیے اور پھر قارئین کے خطوط آئے تو سب سے زیادہ تحسین باعث صد افتخار، افتخار مجاز کے لیے تھی۔ اسی طرح ایک لاجواب تحریر انہوں نے ابن انشا اور اشفاق احمد کے حوالے سے ارسال کی تو روزنامہ ''دن'' میں وہ ان کے حوالے سے میرے لوگو میں چھپی اور اس مہمان کالم نے جتنی داد میری جھولی میں ڈالی وہ مجھے اپنے تمام کالموں کو ملا کر بھی آج تک نہیں مل سکی۔ ''یہ رتبہ بلند ملا، جس کو مل گیا''

افتخار مجاز سے جب بھی بات ہوئی ہے، شگفتہ قہقہوں کی گنگناہٹیں سماعتوں کا حصہ بنی ہیں۔

ایسا لگتا ہے کہ زندہ دلی کی نعمت، دل کا روگ لگائے بغیر عطا بھی نہیں ہوتی۔ ممکن ہے یہ ڈھنگ افتخار مجاز نے اپنے بڑے بھائی اعزاز احمد آذر سے سیکھا ہو کہ اعزاز ہمیشہ کشت زعفران کو اپنے ہمراہ لے کر چلنے کے عادی ہیں۔ یوں مجھ ایسے کن رسیے اس بلبل ہزار داستان کی پرلطف باتوں سے اپنا ٹھرک پورا کر لیتے ہیں۔

جب میری پوسٹنگ ساہیوال میں تھی تو ایک روز افتخار مجاز کا فون آیا، کہنے لگے روزے سے ہو یا نہیں۔ بہرحال صبح صبح ٹی وی اسٹیشن پہنچ جاؤ کہ حالاتِ حاضرہ پر تمہاری دانشورانہ رائے درکار ہے۔ میں نے انہیں بہتیرا سمجھایا کہ میں ایک نارمل آدمی ہوں PET دانشوروں کے قبیلے سے میرا کوئی ناتا نہیں ہے، لیکن انہوں نے اپنے پروگرام میں مجھے دانشور بنا کر ہی چھوڑا۔ ویسے اس دن مجھ پر یہ راز بھی کھل گیا کہ جس طرح نیم وا آنکھوں والے چپ کی چادر تان کر بیٹھے ہوئے کو خوش عقیدہ ''پہنچا ہوا'' مان لیتے ہیں اسی طرح متین سی صورت بنا کر اوکھے اوکھے لفظوں پر مشتمل دس بارہ فقرے ادا کرنے والا ''دانشور'' تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ بس ایک کام پوری سنجیدگی سے کرنا ہوتا ہے کہ جب تک کیمرا آن ہے ہاسا بالکل نہیں نکلنا چاہیے۔ آزمائش شرط ہے!

چند سال ادھر کی بات ہے کہ میرے افسانوں اور ایک ناولٹ پر مشتمل ایک مجموعہ چھپ رہا تھا تو جی میں بے طرح خیال آیا کہ اگر افتخار مجاز دیباچہ لکھ دیں تو کیا بات ہے! تمام تر بے تکلفی کے باوجود میں جھجکا بھی کہ جانے کیا کہہ دیں اور اگر لکھیں بھی تو کیا لکھ ڈالیں؟ پھر کرنٹ افیئر، کے پروڈیوسر کی ہنگامی نوعیت کی مصروفیات کا بھی ایک حد تک مجھے اندازہ تھا۔ تاہم ہچکچاہٹ پر قابو پاتے ہوئے میں نے فرمائش کر ہی ڈالی۔ افتخار مجاز نے نہ صرف میرا مان رکھا کہ ہامی بھر لی بلکہ میرے ''توائی'' ڈالنے پر فوری ترجیح دیتے ہوئے ایک مبسوط مضمون بھیج دیا۔ اس سطح کے لکھاری کے لیے پڑھ کر تبصرہ لکھنا لازم نہیں ہوتا۔ مگر انہوں نے میری ایک ایک کہانی کو بغور پڑھا ہوا تھا کہ کچی پنسل سے متعدد مقامات پر اصلاح بھی کی ہوئی تھی۔ بعض حشو و زوائد کو انہوں نے اس ہنرمندی سے دور کر دیا کہ عبارت میں جان پڑ گئی۔ یوں افتخار مجاز کو میں اپنا استاد کہوں تو مجھے اس کا حق پہنچتا ہے۔

افتخار مجاز کی تحریروں کے حوالے سے مجھے بس اتنا کہنا ہے کہ بنیادی طور پر یہ مزاح نگار ہیں۔☆ ان کے مزاج کی شگفتگی پوری طرح ان کے اسلوب میں سمٹ آئی ہے۔ اگرچہ انہوں نے مقدار کے اعتبار سے کم لکھا ہے، لیکن وہ تخلیقی سرمایہ لذت سے ایک دم سرشار ہے۔ افتخار مجاز کو پڑھنا اور ان سے ملنا مجھے ہمیشہ اچھا لگا کہ سچی بات ہے ایسی خالص محبت، ایسی مخلصانہ مہک اگر فی الوقت نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔

آخر میں میں اپنے دوست اور خوش نوا شاعر علی رضا کے لیے خاص جذبے کا اظہار کرنا چاہوں گا کہ اس نے معتبر ادبی علمی شخصیات کو محفوظ کرنے کا جو کتابی سلسلہ شروع کیا ہے وہ اگرچہ بڑا محنت طلب اور اعصاب شکن کام ہے مگر نہایت خوش آئند ہے کہ اس بہانے چند لوگ نہیں، ایک دور نقش دوام میں تبدیل ہونے جا رہا ہے اور یہ کام وہ اس عہد میں کر رہا ہے جس میں کہ رتوندی (Nyctalopia) کا عارضہ عام ہو رہا ہے۔ افسوس تو یہ ہے کہ بیوپاریوں میں نہیں لکھاریوں میں آنکھ کی یہ بیماری بڑھ رہی ہے کہ انہیں روشنی سے عداوت سی ہوتی جا رہی ہے۔ رات میں دیکھنے کے یہ اس قدر خوگر ہو گئے ہیں کہ اُجالا انہیں ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ علی رضا چونکہ Lotus Land کا باشندہ نہیں لہٰذا اس کام دیو نے کچھ نہ کچھ کرتے رہنا ہے۔ اب اس نے جس میدان کا چناؤ کیا ہے مجھے اس کے ہر طرف محبت کے شجر اُگے ہوئے نظر آ رہے ہیں اور ان درختوں کی اوٹ سے ادب کا منور چاند اُبھرتا ہوا بھی صاف دکھائی دے رہا ہے۔ سو ویل ڈن شیر دل، علی رضا!!

☆ افتخار مجاز مدت مدید سے ایک ایسے شعبے میں جاب کر رہے ہیں جسے رابطوں کا جہان کہنا چاہیے۔ اس جام جم میں ہر ممتاز چہرہ اُبھرتا ہے۔ یوں عمر بھر یہ مشاہیر میں گھرے رہے ہیں۔ علم و ادب، فنونِ لطیفہ، سیاست، سپورٹس...... غرض ہر صیغے کے نمایاں افراد ان کے ذاتی تعلق کے دھاگے میں پروئے رہے ہیں۔ اگرچہ ان غیر معمولی حضرات کے حوالے سے انہوں نے خاکہ نما تاثرات لکھے بھی ہیں، لیکن افتخار مجاز اپنی ہمہ گیر ملاقاتوں پر پھیلے Mosaic کو سامنے رکھ کر باقاعدہ Memoirs لکھ سکتے ہیں۔ اس طرح اُردو ادب کو ایک مزے کی آٹو بائیوگرافی مل سکتی ہے۔

اساطیری لہجے کا جمالیاتی شاعر

سلیم شہزاد

رنگ اپنے سنگ کائناتی آہنگ سمیٹ لے تو دستِ ہنر دھنک کی آمیزش کو لفظوں کے آویزے پہناتا اظہار کی نئی راہیں تلاشتا اعتبار کی اُس سطح پر پہنچتا ہے جہاں سخن اپنا پیرہن بدلتا نظر آتا ہے۔ آسمان سے نور برس کر لفظوں کو نئے پہناوے پہناتا اس بارگاہِ عالم میں سر جھکاتا نور سمیٹ کر الحمد کی چادر پہ ویدوں کا پاٹھ سناتا ہے:

کاندھوں پہ دھرے رکھوں یہ الحمد کی چادر
ویدوں کا کوئی پاٹھ سناتے ہیں مزامیر
ورے ترے، دیوار ترے، ہاتھ ہلائیں
تا حد نگہ سد نگہ تیرا ترچ میر......!!

حمد کی نئی شکل سے میرے خیال میں موجود شاعری بدلتی نظر آتی تھی کہ ہنر کا عجز سے مل کر اسلوب کو دو آتشہ کرنا صرف مشکل ہے بالکل ممکن ہی نہیں۔ اسطورا کی نمو سے شاخِ دل بھگوتا احساس کی فضا کو بیگانگی کی سطح پر لاتا یگانگی تک پہنچتا ہوا عامر سہیل جب درد کے پاکیزہ گھر میں بیٹھ کر یاد کی فصل بوتا ہے تو عصری مانوسیت دو قدم پیچھے ہٹ کر اس سے سوال کرتی ہے کہ تم اسطورا کی آنکھ سے کاجل نکال کر اسے تہذیبی کھنڈر کے حوالے کرنا چاہتے ہو! وہ ہنستا ہے کہ اسطورا تو میرے دل میں بیٹھ کر میری پلکوں پہ بچی زمانے کی نمی کا بیاں ہے۔ مجھے حال میں رہنا ہے۔ میں تمہاری ہم عصری پہ نازاں ضرور ہوں مگر ماضی پرستی میرا وطیرہ نہیں کہ میں ماضی کو حال کے کال سے بچا کر جمال کے کمال تک پہنچانا چاہتا ہوں۔

میرے ہاتھوں میں استنبول کی راتوں کا سحر جاگتا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ یاقوتی قصبوں میں چمکتے فواروں کا پانی کہیں صلیبی ہونٹوں سے مصلوب ہو کر شرابوں میں نہ مر جائے۔ بحرالکاہل سے بحرالمتوسط تک اسموں کا حسن گنتا ہے۔ میں ابھرے جسموں کے ہونٹوں پر رنگوں کے چراغ جلا کر مکاؤ کی کسبیوں کو غزلانا چاہتا ہوں۔ میں میگھ کی تیج پہ بیٹھا عدیس ابابا کے گھمنڈ پہ نالاں ہوں مجھے عداوتوں کی کہاوتوں سے بیر ہے۔

برص کے پیرہن میری آنکھ جلاتے ہیں۔ مجھے مراکش سے بات کرنے دو کہ حکایت کے تابوت عزادار پتھروں کے جلو میں ہیں۔ ایشیائی گھر استوائی دھوپ میں اُلٹے نم کی بھیک مانگتے ہیں۔ مگر غدر کے دن ہیں۔ قدیم بوبرجیوں میں فراق کی آگ رفاقت کی باگ تھامتی نظر نہیں آتی۔ تبھی تو ناآسودگی، چھنے یاقوت اور موتی پارچات آئینوں کی باڑ پہ کھڑے مہاجر موسموں کی باس سے گنتی وعدوں کی آس کھوجتے ہیں کہ خلیج فارس کی کھاری آنکھوں کے رکھ رکھاؤ سے کھیتوں کے گھاؤ بھریں، زمانوں کا پھیر پھرے، کوئی کنج زیتون ملے۔

آیتوں سے شکایتیں کرتی ہیں۔ اجل کے تکلے سے کنار اُردن کی بلکتی خلقت کو سسکتی مٹی پہ بٹھاتا ہے۔ مجھے گھروں کو بے گھری سے بچاتا ہے۔ ''عین الزیتون'' میں ہزیمتیں پشت پہ رائیگانی کا گیت لکھ رہی ہیں۔ مجھے جلاوطن عورتوں کے نامراد جسموں سے بہتے خون کا رنگ اُٹھانا ہے کہ کھاری زمین نئے جنموں کے جنم جنیں۔ لبنان کو سامرہ و محادثہ یاد دلاتا ہے کہ مشرقِ وسطیٰ اسم غافل سے مقدس منظروں کی گھنٹیاں اُٹھائے اور آوازے دیتے سجدوں کا قرض چکائے۔ مجھے مشہد کے ستونوں کو احرام باندھنا ہے کہ آہن گرنشینوں میں بیٹھ کر بیروت کی صبح دیکھیں اور یہودی بستیوں سے جب بھی کوئی تیر آئے تو رملہ کے جسم سے شہد کی نہر نکلے۔ یہودی دلگیر ہو کر اپنے ناخن چبائیں۔ وباؤں کے طاقچے میں بیٹھے بدلحاظی کا خریطہ بنیں۔

مجھے بارودی جیکٹوں سے بھری مکڑیوں کی قبیل کا قصہ سناتا ہے۔ آفت زدہ افغان علاقوں کے پاؤں پہ پوشاک دھرنی ہے کہ صبر صحیفے سکھ کا سیپارہ پڑھیں۔ مجھے دارالخلافہ میں جلی انگلیوں کے نشان دکھانے ہیں کہ اختیارات جب اچھوت ہو جائیں تو آنکھوں کا چڑھاوا کاگوں کی طرح نیند سے سیل کر بھی خواب توڑتا اور بحر کی باگ موڑتا ہے۔

دلائی لامہ پڑوس کے
شب کدوں کے مہماں
شراب و شطرنج کی
تمہداریوں سے نالاں
تجارتی کوٹھیوں میں بارے
کنولتے، غزالتے
ماس کا بھاؤ
گر گیا ہے!!

(مکاؤ کی کسبیاں)

عدیس ابابا میں صبح کا رنگ آبنوسی
گھروں پہ ہیں داغ برص کے پیرہن عروسی
عدیس ابابا گھمنڈ کے تخت پہ سبک سر
عدیس ابابا کی جلد پر آنسوؤں کے استر
ہتھیلیوں میں نہ میگھ کی کوئی بوند چمکے

نہ کیچڑ کے کنول پہن کر لباس دکھے
خلیج فارس کے ماہی گیروں کے کھردرے دل
خلیج فارس کی کھاری آنکھوں کا رکھ رکھاؤ
خلیج فارس کی حسن چھلکاتی سیرگاہیں
خلیج فارس کے سورماؤں کا یہ سبھاؤ
خلیج فارس کا حزن اور اس کی بے یقینی
خلیج فارس کے زائچے، کہنیوں کے گھاؤ
(خلیج فارس)

یہاں ہاتھوں میں بس مٹی کے ڈھیلے
کہاں تک ریت اب اندوہ جھیلے
بہت کچھ سن چکی دیوارِ گریہ!
بہت کہہ چکا اُردن کا پانی
(یہودی بستیوں سے تیر آئے)

زمیں بیسوا،
جس کے رُخسار
غازے کے نم سے تپیدہ
زمیں عشق اوکھوٹ
اور بدلحاظی کا
پہلا جریدہ!
(رملہ)

وہ مردہ خانوں کی آنکھیں تھیں
کرفیو کے دن بھی
گھروں سے سج کر نکل رہی تھیں!
(Blach widows)

شاعری کے اوتاروں نے اپنے کھردرے ہاتھوں سے جس طرح اس کا پیرہن تار تار کیا ہے، اس سے ایک گمنام اداسی نے جنم لیا ہے جو کیسری بن کر نا آسودگی کی لاحاصلی کی خود کلامی میں رشتوں کا رونا روتے ہزیمتوں پر سسکیاں بھرتی ہے تو شاعر رعشہ زدہ ہاتھوں سے بٹوارے کا موسم گوندھتا ہے اور رحل پر پڑے صحیفے کی آنکھ میں پانی بھر آتا ہے۔ اس کی ایڑھیوں پر جسموں کی بینائی منافقت کی حدیں پار کر جاتی ہے۔ وہ محبت کو بدشگونی کے آفتاب میں بھگوکر انکار کی آیتیں پڑھتا پڑھتا اساطیری بنت میں یونانی نقش ڈھونڈنے بیٹھ جاتا ہے کہ جوارِ حسن میں پناہ لے سکے۔

وہ زمینوں میں گناہوں کے تعویذ اُتارتا ہے کہ پھیر کھاتی کائناتوں کے ہجر سے دہکتی عمر کیسری جہانوں پہ کھل سکے۔ وہ محبت کے سبزے کو مخمل میں لپیٹ کر سیندوری ہوا میں اُچھالتا ہے کہ میگھ برسے، سرمئی ہجر ہاتھوں سے پھسل کر تھکتی دھوپ تک پہنچے اور انتظار کا دھان کوٹتی عورتیں خیانت کی گٹھلیوں سے اندھیرا نکال کر جمالیاتی جدول میں ٹھہرے براعظموں تک پہنچے کہ نہتی عورت زمیں کو آسماں تک اُٹھا پائے۔

وہ شانت گھڑی کے شبھ سپنے دیکھتا کسانی نیند کو نظماتا دھوپ کا بھوجن کرنے بیٹھ جاتا ہے کہ محبت کے شہدوں کا بھید پا سکے۔ پانیوں کا بھجن گاتے وہ بدن بدن اتنا روتا ہے کہ زمیں اُجال سکے۔ مگر رات ہے کہ آواز کے ساز پہ ٹھہر جاتی ہے۔ کسی آواز کا رشتہ بھیروں کی پھوار کی طرح اس کے احساس کو گیلا کرتا ہے۔ مگر عذاب ہے ایک گرم ملک کی کہانی جس کی شبوں میں مہاجرت کے ٹکڑے فراق زادوں کی طرح گھومتے ہیں۔

وہ مٹی کی رگیں کھینچتا تہواروں کے سیاروں میں بیٹھ کر داغستان کی ماؤں کا دکھ اوڑھ لیتا ہے کہ شمالی بددعا سے اشراق کے پاؤں اینٹھ گئے ہیں۔ اس کی آنکھ میں مضافاتی پن چکیاں چلنے لگتی ہیں تو وہ نیلابی زینہ ڈھونڈتا دھانی عمروں کو سسکتے اندھیرے میں چھوڑ کر قدیم تنہائیوں کی کہانیاں لکھتا جھاڑ جھنکار کھانستا ہے اور پھر گردن گھما کر چھ دنوں کا سود یکجا کرنے بیٹھ جاتا ہے تو بے وفائی کی تمکنت خوبصورت عورتوں کی بے نیازی سے اٹ جاتی ہے۔

شاعری اک زن خود گزیدہ
زلیخائے بے پیرہن
پنڈلیاں جیسے ترشا ہوا کوئی شیشہ
مگر کھردرے بھدے ہاتھوں کے
بے فیض سے چوکھٹے میں
یہ جیسے فسادات کی زد میں آئی ہوئی......ایک
لاچار کم عمر بیوہ......
(شاعری)

خون سے لتھڑی چپلوں
آنسوؤں سے تر قمیضوں
اور پسینے سے بھری
شمیزوں کی تحقیر کے نواح سے......!
عجز کی گھنٹیوں کے بلاوے سے بندھے
درباری پہناوے کے امین......
جب شاعروں کو نظمیں لکھنے
سے روک رہے تھے
(نظم)

صحیفے رحل پر اور آنکھ میں پانی!
دُعائیں پھونکتے جاتے ہیں اور
رعشہ زدہ ہاتھوں سے سینہ کوٹتے ہیں

....

غزل کہتے ہیں اور بوڑھی طوائف سے
گلے لگ لگ کے روتے ہیں زمانے کی!

....

کبھی رُندھی گمبھیری آواز کے
استر کھلیں گے
کب ہٹے گا پردۂ سیمیں سے
عکس سیمیا!
شب گئے، کمبوڈیا کے
ایک ریستوران میں
انجلینا جولی آخر!
کب انڈیلے گی گلے میں
کچی دیہاتی شراب!

کب کھلے گا اس زمین پر
ایک ملکوتی حجاب!
(Angellina Jolie کے لیے ایک نظم)

دشت رقاصہ کے گھنگرو سے بندھا ہے کہ سفر پہیے سے رات کی رات میں اک تیز گناہوں کی پھوار، شہر کے شہر بہا لے گئی تنکوں کی طرح ایک غزلائے ہوئے دن کی کہولت سے پرے

(How many times I have cried for you)

اندھیر کوٹھڑیوں میں
انتظار کا دھان کوٹتی عورتیں
کھردرے ہاتھوں سے دن بھر کا
گوبرا کٹھا کرتی ہیں، مٹی کی ہانڈی
میں اُبلتی ہوئی ہڈیوں کی طرح
عورتیں ازار بند سے چابیوں کے گچھے
باندھ کر نیند میں چلتی ہوئیں
(ہم عورتیں دیکھنے کے لیے جمع ہوئے ہیں)

قصباتی کرتا پہنے دودھ کٹورا امبر گیتوں سے بھر کر غنائی لہجے کی پگڈنڈی پر بھور بھیے چلتا عامر سہیل سے کوراکھی باندھ کر سرسوں کا گیت چنتا ہے۔ پیاں بھار سج پی کے درشن سپنوں کے منڈپ کی جاپ پر ہلارے لینے لگتا ہے۔ وقت کا کھتری مٹی کے ایمان پر اتر آتا ہے اور مزدوری کی راکھ سے کوڑھی دنیا کے بے ساکھ کو دھڑ دھڑ جلاتا ہے تو پھر اک ٹھکری بادل اُڑن کھٹولے میں بیٹھ کر دوشیزہ کا سوت بنتی ہے تو بارش انت سمے سے گھاٹ سے چھلکتی کیسری رنگ بناتی ہے نظر آتی ہے۔

شہد سے میٹھے لوگ زبانوں، گڑ سے میٹھے ناؤں
باتیں جیسے تانے کوئی چھتری چھتری چھاؤں
(نظم)

....

چڑھیونی بے ساکھ
بالوں میں بادل کے چھلے
چھڑی میں تریاق
دھڑ دھڑ جلتے
سوکھے بازو
مزدوروں کی راکھ
(چڑھیونی بے ساکھ)

تھکا تھکا اک جسم سلونا جگے جگے دو نین
ابرو کھینچ کے باڑ لگا ؤ راہ نہ بھولے رین!!
(دوھے)

انگ انگ سے رنگ رنگ کے اڑیں شرارے
گاگر تن کی آپ بھنے، انگیا چھکارے
سپنوں کی منڈپ کی راکھ پہ چتا پیارے
جاپ جاپ پہ جاپ جاپ پہ پینگ ہلارے
(سج سج)

اساطیری محبت میں لپٹا ان دیکھی دنیا ئیں دکھانے والا عامر سہیل غزل کی مچان پر بیٹھتا ہے تو یوں لگتا ہے کہ لفظ اس کی مٹھی سے تسبیح کے دانوں کی صورت گر کر ایک ایسا ماورائی حصار کھینچتے ہیں کہ پڑھنے والا خود کو اسطورا کے حوالے کر کے اس کی بھول بھلیوں میں کھو جاتا ہے۔ اس نے غزل میں نئی تراکیب نئے حوالے اس نئی جمالیات کے ساتھ بنائے ہیں جو اس کو ملائکہ کی کہانی سناتے حجرے کے روزنے کی بجھارت بجھاتے ہیں۔

نگاہ بد ہو کہ دست حسد پرے رکھے
خدا وہ تیل کے چشمے سدا بھرے رکھے
سدا بلند کھجوروں کے نخل اور باغات
وہ پھول، پات، ثمر، پیڑ سب ہرے رکھے
دمشق و مشہد و کابل کا رزق تا بہ ابد
کہیں پہ کم ہو تو اسباب دوسرے رکھے
میں تیری مٹی بدن پہ ملنے کو آ گیا ہوں
میں تیرے قصبوں کی دھول، لبنان کی کہانی

....

عراق اب کسی بیوہ کا حُسن ہے عامر
وہ جس کی لو سے جہانوں نے اکتساب کیا

....

ذہنوں کو بھی تعزیز کے تہہ خانوں میں رکھیں
جب گر در کھے جائیں کسی ملک کے بازو

....

مضافاتی آنکھیں اساطیری
زمستاں میں صبح مزامیری

....

وہاں گفتگو کو مکالے کو ملائکہ
میں یہاں زمیں پہ کس گمان میں آ گیا

....

تری مٹی کی امانت ہے لہو کی گرمی
میں ترے ایک سپاہی سے زیادہ تو نہیں
یہ کارخانۂ افلاک و خاک و آب و سراب
ہمارے عجز کے کب آ سکا حسابوں میں

....

تری حجرے کے روزینہ یہ اُترن
دہک مٹی کے پیالے میں حکایت
مری لاٹھی میں جھرنوں کا بلاوا
مگر دل میں تہجد کی مسافت

....

عصا بردار ہم سے پوچھتے ہیں
یہاں چشموں سے کب پھوٹے گا پانی

....

وارفتگی ہیشگی کی فضا بنا کر کائناتی حسن پر لحن داؤدی بن اُترے تو شعیر اپنے بہاؤ کے سبھاؤ میں یوں مچلتا ہے کہ تڑپ ہوک بن کر دل میں بیٹھ جاتی ہے۔ لفظوں کے آبگینے تراش کر تخلیقی رچاؤ رچانا کہ آنکھ آنسوؤں سے ہم کلام ہو کر ہجر میں اس طرح وصال پرو دے کہ سماں اپنے ہونے کی گواہی دے۔ عامر سہیل کی غزل کا امتیازی وصل ہے۔

خود اپنے درد سے آئی ہے آنکھ میں یہ بہار
کسی کے خواب کا ٹکڑا نہیں چھبویا ہوا

....

جو ہو لباس کی حاجت تو پنچھیوں کی طرح
ہمیں بھی اِذن کہ پہنیں پھریں ہوائیں ہم

....

وہ بے گھری ہے کہ ہیں دربدر زمانے بھی
سو ایک خواب کا ٹکڑا ملے سکونت کو

....

اُدھڑنے لگیں کچی ترپائیاں
گرے جسم پر رات شہتیر سی

....

بدک رہے ہیں خود اپنے ہی پیرہن سے گلاب
اُتر رہی ہے کسی آرزو سے حیرانی

....

بچے کھچے ہوئے ٹکڑے ہیں خشک روٹی کے
گنے چنے ہوئے کچھ دن ہیں رفتگاں کے بغیر

....

ہم اعتکافِ ہجر میں بھی منحرف نہ تھے
اس آدمی کے جس نے محبت عذاب کی

کبھی تو عشق کی بارہ دری سے ہوتے ہوئے
گزر ادھر سے کہ میں ہجر سے گزرتا ہوں

....

یہ زندگی جو تمہیں روندتی ہے پاؤں تلے
کبھی ہنسی تھی نگوڑی چھنال ہم پر بھی

....

عامر سہیل اپنی غزلوں میں ہندی لفظوں کا چناؤ اس احتیاط سے کرتا ہے کہ شعر کا مور پنکھ ہجر سندیسے لے کر دکھ کو سکھ کی بپتا جان کر ریگ کی آنکھوں سے اُڑتی چنری سے جل پریوں کا راس رچا کر بھول جاتا ہے۔ وہ ہندی، پنجابی اور اردو کی آمیزش سے غزل کی زبان کی تشکیل اس نئے انداز سے کرتا ہے کہ غزل اپنے رچاؤ میں رچ کر اپنے وسیب کو ایک نئے ڈھنگ کے رنگ کی دکھاتی نظر آتی ہے!

ادھ جگے جزیرے پانی کے، اب کھلیں نہ پنکھ کہانی کے
اک بھرے سمندر کے اندر جل پریاں راس رچاتی ہیں

....

اک پنچھی نے اُنگلی پکڑی
اور دل میں پنکھ کھلار گیا
اک انگیار تار پہ ٹنگی رہی
اور گیہوں کا تیوہار گیا

....

بھادوں سا کوئی ہجر کہ پلکوں سے بندھا ہے
ستلج کی دوپہروں سے بھٹکتی ہے جوانی

....

ماتھے پر سورج کا تلک لگا کر عامر
کچی اینٹوں پر مزدوری جاگ رہی ہے

....

میں چھوڑ آیا تھا گاؤں میں جن کے رنگ ساتوں
طلوع ہونے لگیں وہ آنکھیں، نگر نگر سے

....

اک الہڑ جسم کو چھلکائے
جھرنوں کو ٹوکے ندی کوئی

....

یادوں کے گھاؤ بھریں کبھی
پلو سے پیاس نچوڑ سکیں

....

بادل ناک چڑھائے گزریں، بوند پڑے، برسات نہ ہو
برکھا چڑھے جدائی والی، رت ایسی ہیہات نہ ہو

....

نقرئی لہجے کی تقویم میں بیٹھا عامر سہیل مضافاتی مزامیر بجاتا تجسم کی اڑان پر پہنچتا ہے تو اسطورا کی معنویت عصریت کے قدموں میں نئی شان سے آبیٹھتی ہے۔ وہ مطلع لکھتا ہے تو ہر مطلع دوسرے مطلع سے آگے بڑھنے کی فکر میں بھاگتا ہے۔ نئے مضمون اس کی کرافٹ کی جکڑ میں یوں جکڑے جاتے ہیں کہ وہ موجودہ لمحے کو محدود امکانات سے بچا کر لازمانی ممکنات تک چھوڑ آتا ہے۔

لفظوں کے چشمے اس کی پوروں سے یوں بہتے ہیں کہ تہذیب اپنے تمدن پہ حیرانی کی پوشاک ڈال دیتی ہے۔ اس نے شاعری کو کلیشے کے بوجھ سے آزاد کرا کے علامتی لاموجود کو موجود میں پرو کر ایک ایسا لسانی پیرہن بنایا ہے کہ زمانی واقعات اس کی تلمیحات پر ثبت ہو جاتے ہیں۔

وہ مضافاتی ہاتھوں سے لحاتی وجود پر لفظوں کے تاریوں پروتا ہے کہ تغزل کی آنکھ چمک بن کر پھیل جاتی ہے اور ہم عصروں کے چہروں پر فسوں ٹھہر جاتا ہے۔ اس کے دوہے رم جھم کی طرح برستے روحوں کو آسودگی بخشتے ہیں۔

عامر سہیل ایسا صاحب اسلوب شاعر ہے جس کے حلقوم سے زمانے کی کجی اور رفاقت کی دھجی تلاوت سے بھی نظر آتی ہے۔ قرینہ اس کے ہاتھوں سے نکل کر لفظوں کے ہاریوں پروتا ہے کہ آنکھ مشک باری سے اشک باری تک پھیل جاتی ہے۔ ہم عصری میں اس کے پاؤں یوں چلتے ہیں جیسے آہو مشک ناف لیے پھرتا ہو اس کا آہنگ رم آہو کے ساتھ وارفتہ بھاگتا نظر آتا ہے۔ لفظوں کے بہاؤ سے اس نے نظم و غزل کے جو خار چنے ہیں وہ موجود شاعری میں مفقود نظر آتے ہیں۔

عامر سہیل نے ''تیوہار کا پانی'' اپنی شاعری پہ یوں چھڑکا ہے کہ اسلوب اساطیری حوالے بناتا نئے جزیرے پہ بیٹھ جاتا ہے۔ اس کی اقلیم میں حسی ادراک نئی حسی جہت کے امکانات کی آخری حد تک پہنچتی نظر آتی ہے کہ جداگانہ اسلوب لفظوں کا نیا برتاؤ اور خیال کی اچھوتی اُڑان، اس کے ہنرمند ہاتھوں سے جو آفاقی منظر بناتی ہے وہ جیتے جاگتے چلتے پھرتے یوں نظر آتے ہیں جیسے گلوبلائزیشن اس کے ساتھ ساتھ پھرتی ہو۔ جس مہارت سے وہ منظر اُجالتا ہے یوں لگتا ہے کہ دست قدرت نے اس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھا ہے۔ اگر معاصر شاعری کے دس اہم شعراء کے نام لیے جائیں تو مجھے عامر سہیل خاصے اہم درجے پر فائز نظر آتا ہے۔

افسانہ

بدن دریدہ

پروین عاطف

ایسا ہونا جب ممکنات میں سے ہے ہی نہیں کہ کسی راگ کا کوئی سُر کسی مصور کی کوئی تصویر یا کسی سنگ تراش کا کوئی مجسمہ اپنی تخلیق کار سے کہہ سکے کہ میری ناک ذرا اور ستواں گھڑ دیتے یا اس راگ میں نکھاد کی جگہ پنچم کی جگہ بنتی تھی تو پھر مرد لوگ اپنے رس سے کیسے کہہ سکتے ہیں کہ عورت کو اگر تم اس بے رحم حد تک دلربا اور پرکشش نہ بناتے تو حضرت آدم سمیت پوری مرد جاتی کو رہتی دنیا تک یوں بال سے باریک اور تلوار سے تیز دھار، پل صراط پر چل کر زندگی نہ گزارنا پڑتی۔

میرے جد امجد کے جینز میں تو عورت ذات کو دیکھتے ہی خودکشی بارودی جیکٹ پہن لینے کا اُبال ودیعت تھا۔

کسی بھی حسین عورت کی چمک دمک، چال ڈھال، لبھاؤ ان کے عناصر کو پرزے پرزے کرنے کے لیے کافی تھی۔ میرے دادا عظمت چوہدری (خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے) وطن کے پہاڑوں پر عاشق تھے۔ منچلے دوستوں کے ساتھ وادیٔ کیلاش کی سیر کو گئے۔ وہاں ہری بھری وادی میں ایک یونانی دیوی سمان کیلاشی لڑکی پر بری طرح عاشق ہو گئے۔ اس کے حصول کی کوئی صورت دکھائی نہ دی تو پچھلی صدی کے شاہ انگلستان کی طرح دین دنیا چھوڑ کر وادی کے ایک کونے میں جھگی ڈال کر بیٹھ گئے۔ یوں اپنے عشق مجازی کے راستے عشق حقیقی سے روح نکھارلی۔

کرناٹک ہندوستان کے گنیش بابو سنسکرت کے پروفیسر ہندوستان سے ہجرت کر کے ہماری بلڈنگ کے اوپر والے اپارٹمنٹ میں آن بسے تھے۔ دو چھٹیوں والی ان کی من موہنی بیٹی میری ہم عمر، میرے ہی سکول میں داخل ہوگئی تھی۔ برصغیر کی مذہبی منافرتوں سے اَٹی سرزمین سے باہر نکلتے ہی ہندوستان مسلمان، سکھ، عیسائی، مذہبی زنجیر زنی بند کر کے آپس میں صرف انسانی رشتے قائم کرتے ہیں۔ گنیش بابو خاندان کے ساتھ بھی صدیوں کی ثقافتی اور تہذیبی سانجھ کی بنا پر ہماری دوستی آنا جانا دنوں میں قریبی عزیزوں جیسا بن گیا تھا۔ میں اور گیتا ایک ساتھ سکول جاتے ایک ساتھ آتے تھے۔ کئی مضامین کا ہوم ورک بھی ہمیں ایک ساتھ بیٹھ کر کرنا پڑتا۔ بارہا میں اس کے ساتھ اس کے کلاسیکل ڈانس کی کلاس میں بھی اس کے ساتھ جاتا...... اپنے ٹخنوں تک لہراتے سیاہ بالوں کے ساتھ جب وہ طبلے کی لے پر تھرکتی منہ سے توڑے بولتی تو مجھے لگتا میری گیارہ سالہ دنیا بھی مکمل رقص میں ہے۔

تاتھئی تاتھئی تت تھئی

گیتا اور میں بدن کی دنیا سے غافل، ایک دوسرے کے پکے ہم جولی بن چکے تھے۔ ہم دونوں میں سے کسی کو بھی مندر یا مسجد میں ایک دوسرے کے ساتھ جانے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں تھی۔ اتوار کے روز تو میں ناشتہ کرتے ہی ان کے اُوپر والے اپارٹمنٹ میں ہونے والی پوجا میں شامل ہوتا جسے جگدیش ہرے اور دوسرے بہت سے روح میں روشنی پھیلانے والے بھجن سنتا اور انہیں انہماک سے خدا کے حضور حاضری دیتے ہوئے دیکھ کر سوچتا کہ آنٹی بیلا کے منہ پر بھی اگربتیاں کرتے وقت ویسا ہی جذب موجود ہے جیسا تسبیح پھیرتے وقت میری امی کے چہرے پر ہوتا ہے۔ تو پتا نہیں رب کریم ہر طرح کے مختلف ہجوم کے لیے مختلف قسم کا روپ کیوں نہارتا ہے۔

امریکہ میں پیدا ہونے اور پرورش پانے کا ایک فائدہ تو یہ تھا کہ وہاں کا سماج طرح طرح کی پرانی روایات اور پابندیوں کے ذریعے انسانی شخصیت کے پھیلاؤ کو مقفل نہیں کرتا تھا۔ اس میں انسانی فطری کمزوریوں کی وجہ سے چند صحت مند حدود ناپ جانے کا خطرہ تو موجود تھا لیکن کٹھن اور ہر معمولی غلطی پر احساسِ جرم میں جھلسنا شامل نہیں تھا۔

افزائش نسل اور جنس کے جبلی پہلوؤں کے بارے میں اساتذہ بلوغت سے پہلے ہی سیر حاصل روشنی ڈال دیتے تھے۔ پھر بدنوں میں اچانک آنے والا تبدیلیوں کا زلزلہ ہمیں خوفزدہ نہیں کرتا تھا بلکہ ہم لڑکے لڑکیاں بارہا ہمارے اجسام کا ہمارے ہاتھوں سے چھٹ جانے کی پریشانیوں کا ایک دوسرے کے سامنے اظہار بھی کر دیتے تھے۔ جب ہائی سکول کے آخری برس اچانک میرا سارا چہرہ مولویوں جیسے بالوں سے بھر گیا اور جلد ایڈے بینڈے دانوں کی آماجگاہ بن گئی تو گیتا کے سینے پہ اُبھری دو کچی امبیاں سی دیکھ کر میں نے تجسس سے انہیں چھوا اور شدید درد سے اس کی چیخ نکل گئی تو اس نے کئی دن مجھ سے بات نہ کی اور میں نے سینکڑوں معافیاں مانگ کر اُسے سمجھایا کہ یہ محض اس جہان نو میں قدم رکھنے کا تجسس تھا جس نے مجھے تمہیں چھو کر دیکھنے پر مجبور کیا۔ پھر وہ دیر تک بغیر کسی وجہ کے پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی اور کہتی رہی میں پتا نہیں کیا بنتی جا رہی ہوں۔

ایک ہی بلڈنگ میں اُوپر نیچے رہنے، ایک ساتھ سکول جانے، ایک جیسی سپورٹس میں حصہ لینے کی وجہ سے ہمارے اندر جنس مخالف ہونے کا شعور کبھی بیدار ہی نہیں ہوا تھا۔ ایک ساتھ کراٹے سیکھنے کی وجہ سے پوری طرح بالغ ہونے سے پہلے ہم ایک دوسرے کے ساتھ گھنٹوں کشتی یا دھینگا مشتی بھی کرتے رہتے تھے۔ کالج میں جاتے ہی پتا نہیں کیسے ہم دونوں کے درمیان ایک انجانی سی جھجک پیدا ہونے لگی۔ حالانکہ اس کے بدن کا گدرا پن مجھے رہ رہ کر اُسے چھونے، اپنے کلاوے میں لینے پر مجبور کرتا لیکن گیتا کی آنکھوں میں پھیلا نیا نیا تحیر اور خوف مجھے ایسا کرنے سے بالکل روک دیتا۔ پر اب میرے اندر یہ خواہش چنگاری کی طرح سلگتی کہ میں اسے بے لباس دیکھوں اور اسے اپنے بدن کے اندر جذب کرلوں۔

پھر اچانک ایک دن گیتا کی والدہ نے ہمیں گھر آ کر بتایا کہ وہ از خود کرالہ کے ایک جانے مانے خاندان کے لوگ ہیں اور جو ارفع خاندان گیتا کا ہاتھ مانگ رہا ہے ان کی شرط یہی ہے کہ وہ اپنی باقی تعلیم دہلی یا کرالہ کے کسی اچھے تعلیمی ادارے میں پوری کرے۔ وہ یہاں کی تہذیب اور انداز سے خائف ہیں۔ جدائی کی انہونی نے ہم دونوں، مجھے اور گیتا کو ریزہ ریزہ کر دیا تھا۔ پتا نہیں ہمارے اس وقت کی خواہشات کی تشنگی سے پھٹکتے رشتے کو محبت کہہ بھی سکتے ہیں یا نہیں لیکن گیتا کے چلے جانے کے فوراً بعد میرے ذہن و دل کی گلیاں اُجاڑ ہو گئیں اور اس بدن میں سلگتی چنگاریوں کا ردعمل بارود کی سرنگ پھٹ جانے کے مترادف ہوا۔ سیاہ فام پیٹر اور اپنے چینی امریکی دوست مائیک کے ساتھ میں نے پیشہ ور عورتوں کے پاس جانا شروع کر دیا۔ حیرتوں کے اس جہان نے مجھے تلذذ اور تعیش کے ایسے ہنڈولے چڑھایا کہ دنوں میں گیتا محض ایک سریلی سی یاد بن کر رہ گئی اور بدن در بدن سفر کرتا میں نئے سے نئے جنسی تجربے کی تلاش میں گم رہنے لگا۔ رولر کوسٹر پہ تیزی سے گھومتے انسان کو اشیاء اپنی اصلی ہیئت میں کہاں دکھائی دیتی ہیں۔

ایک تیز جھولے سے دوسرے کے درمیان جب میں کبھی ستانے کے لیے گھر بیٹھتا تو پورا گھر گیتا کی یادوں سے سجا دکھا دیتا۔ وہ جھٹ پٹ میری کمپیوٹر سکرین پر آن براجتی۔ ''وہ ہندولڑکا جو ماں کہتی ہے جنم سے ہی میرا منگیتر ہے اپنے شاہی خون کی نیلاہٹ کے غرور میں گم رہتا ہے۔ ایہ لوگ کڑی ہندو روایات کے پابند اور ''سٹیٹس کو'' کے رکھوالے ہیں۔ یہ نہیں کہہ سکتی کہ تمہارے بغیر ادھوری ہوں لیکن تم یاد بہت آتے ہو۔ کیا چھونے کے لیے (پوری طرح) کوئی مکمل لڑکی ملی؟'' وہ کوئی نہ کوئی اپنائیت کی بات کرتی۔ یہاں انڈیا میں بھی مذہبیت کا رجحان تیزی سے بڑھ رہا ہے کیا ہوگا؟ ہماری بلڈنگ کے پچھواڑے والے بلاک میں اگر مجھے گدرائے ہوئے پنڈے والی کیٹ سمتھ کا ڈانسنگ کلب نہ ملتا تو مجھ پر ونڈر لینڈ کے در پوری طرح کبھی کھل نہ پاتے جسے ''جسم'' کہا جاتا ہے اور گیتا کا پیدا کردہ دوستی کا خلاء مجھے ایک مضمحل بوڑھے انسان میں تبدیل کر دیتا۔ تعلیم کی رسّی مضبوطی سے تھامے رکھنے کے علاوہ میری زندگی کا وطیرہ ایک گمشدہ غزال کی طرح جنگل جنگل، بیلا بیلا گھومنا بن چکا تھا۔

کیٹ سمتھ اپنے امیر کبیر سیاہ فام باکسر شوہر سے طلاق کے ساتھ امریکی قانون کے مطابق اس کی آدھی دولت ساتھ لے کر ہماری پچھواڑے والی عمارت میں آن بسی تھی۔ گدرائے ہوئے پنڈے والی کیٹ سمتھ نہ صرف زندگی کو میلے کی طرح منانے میں یقین رکھتی تھی بلکہ خود ایک بہت اچھی رقاصہ ہونے کی وجہ سے اس نے اپنے اپارٹمنٹ میں ایک ڈانس سکول کھول رکھا تھا۔ کیٹ بڑے فلسفہ دان ''نٹشے'' کی طرح کہتی تھی انسانی جسم ارفع ہے اور اس کا اپنا ایک الگ تہذیب و تمدن ہے۔ اس کا اپنا بدن بھی ٹپکے آم کی طرح ٹپ ٹپ رس برساتا اور مسلسل مدعو کرتا تھا۔ کیٹ کے ڈانس کلب کا ایک ڈسپلن ممبران کا نوے فی صد بے لباس رہنا تھا۔ لوبان کا جو دھواں کلب کی فضا کو پراسرار بناتا وہ ذہن کو بہت سی سماجی بندشوں اور پابندیوں سے آزاد کر دیتا۔ اس دھویں میں کسی انوکھے نشے کی چس تھی۔ کیٹ نے اپنے ڈانس کلب کو اصل میں بدن کی پوجا کا ایک مندر بنا رکھا تھا۔ کلب کی موسیقی بھی مختلف اور سحر انگیز تھی۔ وہ عجیب جادوگرنی عورت تھی۔ وہ ڈانس کلاس میں اچانک کوئی ایسی راس رچاتی کہ رقص کرتے لوگوں کی دھڑکتی، تھرکتی پرچھائیاں شہوت اور لذت سے پرے اپنی ہی ذات کی کھوج میں گم ہو جاتیں۔ وہ واقعی ایک جادوگرنی تھی جس میں موجود ہونے سے انسان کے اندر ایک ایسی خودمختاری اور بغاوت کا احساس جاگتا کہ باہر کی تیز روز زندگی میں شامل ہونے کے خیال سے گھبراہٹ ہونے لگتی۔ مخالف جنسوں کے اجتماعی رقص کے دوران وہ میوزک روک کر بار بار مائیکروفون میں کہتی مرد اور عورت حوا کے ایک ہی بطن سے پیدا ہونے والے دو وجود، دراصل ایک ہیں۔ ایک ہی انرجی سے گھڑے گئے دو وجود۔ جس کے رنگ اور خوشبو میں کوئی فرق نہیں اور اس تقسیم شدہ انرجی کا بار بار آپس میں گھل مل جانا جذب ہو جانا ایک فطری عمل ہے۔ پھر افریقی ڈھولوں کی تھاپ اور دھویں کے سیاہ بادلوں میں ہم سب کی بے لباس چھاتیاں ایک دوسرے میں مدغم ہونے لگتیں۔ ماحول میں مافوق الفطرت کا احساس جاگتا ہم میں سے کچھ لوگ دھاڑیں مار مار کر روتے۔ ایک دوسرے کے سینے سے لگ جاتے۔ کیٹ کی جادوگری

میں مسلسل جاتے جاتے میری تعلیم سے توجہ ہٹتی جا رہی تھی۔ امتحانوں کی کارکردگی مایوس کن تھی۔ میرے والدین سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ امریکی تہذیب میں فرد کی مکمل خودمختاری کے رواج نے اساتذہ اور والدین کی اتھارٹی کو زیرِ زمین دفن کر دیا تھا۔ میرے بینکر ہو والد سمجھدار انسان تھے۔ انہوں نے بنا مجھ سے کوئی پوچھ گچھ ڈانٹ ڈپٹ کیے اپنی ٹرانسفر واشنگٹن میں کرا لی۔ میری ذاتی آمدن صفر ہونے کی وجہ سے مجھے سب چھوڑ چھاڑ کر ان کے ساتھ جانا پڑا۔ تر و تازہ گلابی پھولوں کے اس دھیرج بھرے شہر میں جا کر مجھے احساس ہوا کہ بدن کی دنیا کے تیز تر سفر نے میری روح میں تھکن کا احساس پیدا کر دیا تھا۔ کیٹ اور نطشے کے فلسفے کی حدود بے حد محدود تھیں۔ چاند تارے ساگروں کی گھتی تھیں، آنے والے معجزاتی موسم ان میں نہیں سما سکتے تھے۔

گیتا کی شادی برہمن جاتی کے امیر کبیر لڑکے سے گریجویشن کا نتیجہ نکلنے سے پہلے ہی کر دی گئی تھی۔ ہمارے رابطے کمزور پڑ چکے تھے لیکن بچپن کی معصوم دوستی کی تند نہیں ٹوٹی تھی۔ میں نے اپنی جنسی بے راہ روی کے بارے میں اسے کبھی کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ کبھی کبھار پوچھتی تم زیادہ لڑکیوں کے چکروں میں تو نہیں پڑے رہتے، میں بات مذاق میں ٹال دیتا۔ ''اب تم اگر کسی کے نام کا سیندور مانگ میں بھر کر انڈیا میں گزر گئی ہوتو میں کوئی بدھا کا بھکشو تو نہیں جو زندگی تیاگ دوں؟ وہ بھی ایک برہمن کی ستی ساوتری پتنی کی خاطر!'' چیری کے گلابی شگوفوں سے کھلا واشنگٹن مزاج سے نفس امارہ کی پرورش کا شہر نہیں تھا۔ نیویارک کا مزاج نوٹنکی میلے ٹھیلوں کا سا تھا۔ واشنگٹن کی ہیئت اور تاثر میں کتھک اور بھارت ناٹیم کی گریس اور پاکیزگی تھی۔ ابا کی نیویارک چھوڑ دینے کی دانشوری میری نوجوانی کی بدکی گھوڑی کو صحیح راستے پر لے آئی۔ تعلیم کے سنجیدہ سالوں میں عورت مجھے جسمانی سوں سوں سے الگ ایک برابر کا انسان دکھائی دینے لگی۔

گیتا اور اس کے شدھ برہمن شہر کی شخصیتوں میں کوئی ایسا جنکشن نہیں تھا جو ان کی زندگی کے سفر کو ساتھ ساتھ طے کرانے کا سبب بنتا۔ کرالہ اور نیویارک کی زمین میں براعظموں کے فاصلے تھے۔ پھر وہ طلاق حاصل کرتے ہی ہندوستان سے سیدھی واشنگٹن پہنچ کر میری ہی یونیورسٹی میں داخل ہوگئی۔ ہم دونوں ان بدقسمت لوگوں میں سے نہیں تھے جن کا بچپن ان کے لیے ایک ہوتق چڑیل سے زیادہ کوئی حیثیت نہ رکھتا ہو۔ ہماری یادیں چاندنی میں کھلے زعفران کے کھیت جیسی معطر تھیں اور میری عنفوان شباب کی ہڑبونگ بھی گرمیوں کے پاکستانی جھکڑ کی طرح از خود تھمنے لگی تھی۔ پھر گیتا کی شتیل شانت برسوں پرانی دوستی نے آتے ہی میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا۔ موسیقی، ادب، آرٹ، علم و دانش۔ گیتا کے ساتھ وقت گزارنے سے لگتا زندگی کے بہت سے کھوکھلے خانے کسی ارفع متاع سے بھرنے لگے ہیں۔

میں نے امی ابو سے میری اور گیتا کی شادی کی بات کی ''وہ آپ دونوں کو بھی بچپن سے اچھی لگتی ہے اور اب تو اس کا روپ بھی پہلے سے دو چند ہے۔'' امی کو تو یہی شوق تھا کہ ان کی بہو حسین ہو، جدی پشتی مسلمان ہونے کی وجہ سے وہ یہ ماننے پر تیار نہ تھے کہ ہمیں پیدا کرنے والا رب العالمین ہے۔ وہ باقی تمام تنگ نظر مذہبیوں کی طرح اُسے صرف رب المسلمین مانتے تھے اور اپنے ایک خصوصی مذہبی احساس برتری میں مبتلا تھے۔

''ابا جان! آپ تو جانتے ہیں چتا میں جلائے جانے، مٹی میں دفن کر دیے جانے یا مر جانے کے بعد ''خاموشی'' کے مینار میں رکھے جانے والے پارسیوں کے اعمالی پرچوں کے لیے الگ الگ دفاتر قائم نہیں کیے جائیں گے۔ جہاں انہیں اپنے اپنے ہندو مسلمان عیسائی اعمال ناموں کی فائلیں تھام کر قطاروں میں کھڑے رہنے کا حکم صادر کیا جائے گا۔ وہ تمام عظیم تر شخصیات عیسیٰ، موسیٰ اور محمدؐ اللہ کے تمام بندوں کی فائلیں ایک ہی دفتر میں بیٹھ کر چیک کریں گے۔ کیونکہ ان سے زیادہ اس بات کا شعور کوئی دوسرا نہیں رکھتا کہ رب صرف ایک ہے۔ ابا میری بات پر مشتعل تو نہیں ہوئے تھے لیکن کسی ضروری کام کا بہانہ بنا کر وہاں سے اُٹھ کر چلے گئے تھے۔ امی ایک شانت طبیعت کی مالک تھیں۔ وہ ہمیشہ سے اپنا غصہ یا دکھ اندر ہی اندر پی جانے کی عادی تھیں۔ اس روز انہوں نے طویل عرصے کے لیے اپنے ہونٹوں پر چپ کا تالا لگا لیا تھا۔

گیتا کہتی تھی ایک تو یہاں کی غیر روایتی تہذیب میں پرورش پانے کی وجہ سے میں ایک شدھ براہمنی پرانے عقائد کے مالک خاندان میں ایڈجسٹ نہیں کر سکتی تھی۔ دوسرے تم کسی رومیو جولیٹ عشق کے بغیر ہی میرے وجود کا ایک ایسا ناگزیر حصہ بن چکے تھے کہ تم سے ہمیشہ کے لیے دور رہنا میرے لیے ممکن نہ تھا۔

اسی لیے ہم دونوں نے پی ایچ ڈی کرنے سے پہلے ہی اپنے اپنے والدین کے چہروں پہ چھائی اُداسی اور ناپسندیدگی کی پروا نہ کرتے ہوئے ہندو، مسلم، عیسائی تینوں طرح کی شادیوں کی رسم نبھائی تھی۔ نکاح، پھیروں اور گرجے بھی جگہ ہم دونوں نے زندگی ایک ساتھ گزارنے کے عہدنامے پر مہر ثبت کرنے کا عمل کیا تھا۔ ہم دونوں بے حد خوش تھے۔ زندگی میں پہلی بار ایک ساتھ رہنے سے لگتا تھا آپس میں بیس بال کھیلنے اور رولر کوسٹر پر بیٹھنے کے دن واپس لوٹ آئے ہیں۔ کبھی وہ کوئی میٹھا بھجن گاتی تو میں اس کے ساتھ

بیٹھ جاتا۔ میں اللہ اکبر اللہ اکبر کرتا تو وہ بھی کہتی۔ رب کی عظمت کا پوری طرح احاطہ کرنا کسی بھی انسانی ذہن کے بس میں نہیں۔

پی ایچ ڈی کے آخری برس تک گیتا نے کہا قانون فطرت کے حساب سے مجھے چھبیس برس سے پہلے ماں بن جانا چاہیے تھا۔ میری ایک ایسا بچہ پیدا کرنے کی شدید خواہش ہے جو ہم دونوں کی بہترین خصوصیات کا مالک ہو اور دنیا پر یہ ثابت کر دے کہ مذہب منافرتوں اور دشمنوں کی بجائے محبتوں اور شانتی کی وادی ہے۔ کوئی ڈیڑھ سال تک ہم دونوں کی زندگی ایمن کلیان کے الاپ کی طرح میٹھی اور رسیلی تھی۔ پھر ایک دم اسے جب ماں بن جانے کا جھل پڑا تو وہ تاریخ در تاریخ مضطرب رہنے لگی۔ ہر مہینے کی مخصوص تاریخوں میں جب اس کی آس کی مٹکی پھوٹتی تو وہ زندگی کی ہر سمت کو کاٹ کاٹ کھاتی۔ میری نرم گداز چھوبھی اسے برف کی طرح منجمد کر دیتی۔ وہ بنیادی طور پر ایک فنکار تھی۔ جس لگن سے وہ میوزک کی کوئی الوہی دھن کمپوز کرتی اسی لگن سے وہ ایک ایسا جینئس بچہ پیدا کرنا چاہتی تھی جس میں دو الگ الگ تہذیبوں کے رنگ بھی چھلکیں جو ہم دونوں کی طرح طویل سانجھ اور محبت سے اس طرح کہ بڑا ہو کر مذاہب، ذات پات، فرقوں میں قاش قاش بکھرے رب کو یکجا کرے اور محبت کا کوئی ایسا اُمت سر بھی گائے کہ بستیوں میں لاشوں کے تعفن کی بجائے زعفران کے پھول کھل اُٹھیں۔

اماں اور ابا شاید میری ہٹ دھرمیوں اور باغیانہ حرکات سے تنگ آ کر یا مغرب کی زندگی کے آخری لمحے تک شدید مشقت کی زندگی سے تھک کر پاکستان واپس چلے گئے تھے جہاں کی غربت ماری دیہاتی زندگی میں ایک دوسرے سے جڑے رہنے کی روایت مسلسل قائم تھی اور میرے والدین کے کچھ کزن ابھی تک ان سے بہت پیار کرتے تھے۔

ڈیڑھ برس کے اٹھارہ ماہ کی مایوسی نے جب گیتا کو شدید ڈپریشن اور اپنے بانجھ ہونے کے گلٹ نے بری طرح گرفتار کر لیا اور وہ زندگی کے روزمرہ سے بھی منہ چھپانے لگی تو ہم دونوں کے تفصیلی جسمانی ٹیسٹوں کی خاطر میں اسے اسپتال لے گیا۔

اُس شام جب ڈاکٹر نے مجھے بتایا کہ میرے جرثوموں میں قوتِ مردانہ تو بدرجہ اتم موجود ہے لیکن تخلیق یا افزائش نسل کی کوئی کھاد موجود نہیں یعنی میرا بدن، ایک ایسا کنواں تھا جس کے کھارے پانی سے کبھی کسی کھیتی میں ہریاول نہیں پھوٹ سکتی تھی۔ اڑا اڑا دھم۔ مردانگی عطا کرنے کے بعد اس میں سے افزائش نسل کا معجزہ منہا کر لینے والے کسی بدنیت فرشتے کی تماش بینی کی مجھے کچھ سمجھ نہ آئی۔ گیتا کے بدن کا پور پور زرخیز تھا اور وہ ممتاز کے شیرے سے بری طرح لتھڑا ہوا تھا۔ میں ایک ٹنڈ منڈ پیڑ جس پر کبھی کوئی شگوفہ نہیں پھوٹ سکتا تھا۔ میں گم سم گیتا سے کئی روز تک معافی مانگتا رہا۔ اپنی بے بسی کا اظہار کرتا رہا۔ وہ اپنی شفقت اور کسی حد تک محبت کا دان تو دیتی رہی لیکن ہمارے دلوں کے شیشوں میں جو ترخ اسپتال والوں نے ڈالی تھی اس کا مداوا کسی کے بھی ہاتھ میں نہیں تھا۔ ہم ایک دوسرے کو بانہوں میں لیتے تو ہمارے بدن ان سیلاب زدگان کی طرح تھکے تھکے نڈھال ہوتے پر شور دریا جن کا سب کچھ بہالے گیا ہو۔

مسلمان معاشروں میں بیوی کا بانجھ نکل آنا مرد کی لاٹری نکل آنے کے مترادف ہوتا ہے۔ کسی ہری بھری نئی پائل کی جھنکار مرد کے کانوں میں رس گھولنے لگتی ہے۔ پرانے کھوسٹر کے سمان پہلی بیوی زندگی بتانے کے لیے نئی دلہن کے آشیرباد کی محتاج ہوتی ہے لیکن میرے لیے گیتا کو اپنی جبلی خواہش پوری کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دینے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ میں نے امریکی قانون کے مطابق اپنے لیے تھوڑی سی رقم بینک سے نکال کر اپنے وکیل کے ذریعے باقی سب کچھ اپنے بچپن کی دوست کے حوالے کیا اور جہاز میں بیٹھ کر پاکستان لاہور پہنچ گیا۔

گورنمنٹ یونیورسٹی لاہور میں بطور انگریزی ادب کے سینئر پروفیسر زندگی نہ زیادہ چمکیلی تھی نہ گھٹن ماری پھیکی۔ البتہ لڑکے لڑکیوں کا کلاس، لائبریری یا کیفے ٹیریا میں ایک دوسرے سے الگ الگ رہنا شروع میں کچھ مضحکہ خیز بھی لگتا تھا اور دلچسپ بھی۔

پاکستان میں سماجی اقدار یا ثقافت کی جڑ مذہب تھی۔ یہ اقدار معاشرے کی ترقی میں کوئی رکاوٹ تھیں یا نہیں لیکن ان پرانی روایات اور پابندیوں نے یہاں کی شاعری کو بے حد جلا بخشی تھی۔ پس چلمن کا حسن شاعروں کے تخیل کے لیے تازیانے کا کام کرتا تھا۔

ساری زندگی مغرب کے ''جیسے چاہو جیو'' کی بنیاد پر پھلنے والے کلچر میں گزارنے کی وجہ سے میں نے نوجوان لڑکے، لڑکیوں کی آپس میں یوں مسلسل بولتی حیا سے جھکتی، غصے اور محبت کا اظہار کرتی آنکھوں کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہاں کے نوجوانوں کی محبتوں کے اظہار نیلی شفاف آبشاروں کی طرح سامنے سامنے تھے۔ یہاں جذبوں کی لین دین ویسی ہی تھی لیکن قوسِ قزح کے رنگوں میں لپٹی ہوئی۔

طلاق کے بعد گیتا نے مجھ سے کوئی خاص رابطہ نہ کیا۔ امریکہ میں گزاری اپنی تمام زندگی تو میں بھی ایک پرانی فلم کی سی ڈی کی طرح اپنے ذہن کے کسی مقفل دراز میں رکھنا چاہتا تھا۔ اس معاشرے میں گھل مل جانا بھی میرے پشتینی ڈی این اے کا حصہ تھا۔ تھوڑے ہی عرصے میں یونیورسٹی کا حصہ بن چکا تھا

میرے طلباء میرے شیکسپیئر پڑھانے کے انداز کے دیوانے تھے۔ بالخصوص لڑکیاں، شیکسپیئر والی وہ اپنی سہیلیاں بھی ساتھ لے کر آتی تھیں۔

فروری کے آغاز میں موسم سرما کی روانگی کے دن تھے۔ لاہور کے اردگرد سرسوں کے سنہری کھیت پھول رہے تھے۔ گل نشتر اور املتاس کے پیڑ سرخ اور پیلے پھولوں سے دلہنوں کی طرح سجے تھے۔ یونیورسٹی کے سرسبز لان محبتوں کی آماجگاہ تھے۔

O'er my, My spirit thy ful supremacy thou knowest.

اینٹونی نے قلوپطرہ سے کہا یعنی تم جانتی ہو میری روح پوری طرح تمہارے قبضے میں ہے۔

''سر پلیز! اس لائن کے سیاق و سباق پر آپ ذرا تفصیلی روشنی ڈالیں۔''

کومل نیازی دیکھنے میں تو اُونچے لمبے سورج مکھی پھول کی طرح تابندہ اور توانا تھی لیکن بولتی تھی تو لگتا تھا اوکن کا کوئی کومل سا سر بج اُٹھا ہے۔ متوجہ تو وہ کلاس میں مجھے پہلے بھی بار بار کر چکی تھی لیکن اس کی شخصیت میں انوکھی بات یہ تھی کہ اس کا گدرایا ہوا بدن متوجہ تو کرتا تھا لیکن بلاتا بالکل نہیں تھا۔ دو چار بار اس کے جسم کا سارا جغرافیہ نظروں سے پڑھنے کے باوجود مجھے لگتا تھا میرا نفس امارہ مریئل چوہا بن کر کسی بل میں گھس گیا ہے۔

لیکن جس دن اس نے کلاس میں اینٹونی اور قلوپطرہ کے رومان کے سیاق و سباق پوچھے گھر آنے تک میرے خون کا فشار کنپٹیاں پھاڑنے والا تھا۔ لاہور آنے کے بعد میں نے سرِراہ خریدی ہوئی بازاری عورتوں کے علاوہ کبھی کسی خاتون سے سنجیدہ رابطہ نہیں کیا تھا۔ میں نے اپنی جھنجھلاہٹ اور گھر میں چھائے سناٹے کی وجہ سے اپنے ایک واقف دلال کو فون کر دیا۔ ''جبار رقم کی پرواہ نہ کرنا۔ کوئی ایسی لڑکی لے آؤ جو چوبرجی چوک کی طرح چاروں طرفوں سے روندی گئی نہ ہو اور پچھلی دفعہ والی ایسی منگتی بھی نہ ہو جو اپنے بدن کا بھاؤ انچوں اور فٹوں سے ناپ کر وصول کرے۔''

''آپ کی کسی بھی فالتو حرکت کے پیسے طے شدہ رقم سے الگ ہوں گے۔''

لڑکی واقعی ہاتھی دانت سے گھڑی نازک، خوبصورت اور خوفزدہ سی تھی۔ جی سر! کے علاوہ اس نے نہ مجھے اپنی کوئی لمبی چوڑی دکھی کہانی سنائی نہ کسی قسم کا کوئی بازاری لاڈ ہی کیا۔ گیتا کا میری قدرتی معذوری پر مجھے رد کر دینے کا غصہ میرے رگ و پے میں سمایا رہتا تھا۔ پھر کومل نیازی کا سریلا بدن...... میں نے اپنی تمام فرسٹریشن اور غصے کا بدلہ بے چاری لڑکی پر انڈیل دیا۔ جب میں نے اسے استعمال شدہ ٹشو کی طرح بستر سے دھکا دے کر نیچے گرایا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''پتا نہیں مجھے موت کیوں نہیں آتی۔ میں ختم کیوں نہیں ہو جاتی۔'' میں اس لمحے اسے کچھ نہیں دے سکتا تھا۔ میں نے پاؤں میں جوتا پہنا اور باہر نکل گیا۔

میں نے چاندی کی اس گڑیا نما لڑکی کے رونے کو ایکٹنگ سمجھ کر ڈانٹا اور دو ہزار کے مزید دو نوٹ اس کی طرف پھینک کر وہاں سے فی الفور چلے جانے کے لیے کہا۔ دو روز کے بعد جبار نے مجھ سے گلا کیا کہ لڑکی پیشہ ور نہیں تھی۔ مسلسل بے کاری اور بھوک کی وجہ سے اُسے شوہر نے اچھے قابل اعتماد لوگوں کے پاس جسم فروشی کے لیے مجبور کر دیا تھا۔ اس کے شوہر کا کردار مشکوک ہے لیکن وہ گاؤں کے مولوی کی بیٹی ہے اور اس لڑکے یونس کے ساتھ محبت کی وجہ سے بھاگ کر آئی تھی۔ ایک برس شادی کو ہوا ہے۔ واپس گاؤں نہیں جا سکتی۔ آپ نے جناب اس سے جانوروں کا سا سلوک کیا ہے۔ اس کی گردن کے کھرونچوں سے اب بھی خون رستا ہے۔

پھر اس کے بعد دو تین دفعہ جب نرگس کو میں نے اپنے گھر بلایا تو میں نے اس سے معافی بھی مانگی اور ہاتھ بھی ایسے ہی نرمی سے لگایا جیسے وہ سنبل کا پھول ہو۔ نرگس کی سب سے بڑی خوبی حیا کا وہ فطری احساس تھا جس نے ابھی تک اسے فاحشہ نہیں بننے دیا۔ اب وہ مجھ پر اعتماد کرنے لگی تھی اور قسمیں کھا کھا کر کہتی تھی کہ اس کے شوہر اور میرے سوا اس کے بدن کو کبھی کسی تیسرے مرد نے نہیں چھوا تھا۔ ''پر اس بدقماش لڑکے سے تو تم سچی محبت کرتی ہو نا۔ اس لیے اس کا میرا تو مقابلہ نہیں ہو سکتا۔'' وہ بھی مجھ سے محبت کرتا ہے لیکن بے حد لالچی اور بے غیرت ہے۔ ورنہ کوئی اپنی بیوی کا جسم کسی دوسرے کے حوالے کرتا ہے جی وہ بھی روپے کے بدلے؟؟

یہ عورت کی فطرت میں ودیعت اصلی اور سچی محبت کا مشک نافہ اُسے کیا کیا تگنی کا ناچ نچواتا ہے۔ شاید کوئی محبت سے لتھڑی عورت ہی بتا سکے۔ مرد تو صرف کھرلی میں منہ مارنے والا سانڈ ہے۔ اسے دل کی علالت کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے۔ رب سوہنے نے مرد کے اندر ایسا کوئی میٹر ہی نہیں لگایا جو عورت کے دل کی واردات کو پڑھ سکے۔ ایسی ملیامیٹ ہو جانے والی عورتوں کو تو مغرب والے صرف مائی تھالوجی یا پری کہانیوں کا حصہ سمجھتے ہیں۔ ایسے جان لیوا جذبے عورت کو زمین سے کبھی اُوپر نہیں اُٹھنے دیں گے۔

کومل نیازی یقیناً مجھ سے بیس برس چھوٹی ہوگی پر شاید اس کی ہرنی جیسی قوت شامہ نے میرے اور اُس میں رچی اس کی توجہ کی خواہش سونگھ لی تھی۔ وہ کلاس میں طرح طرح کے سوالات سے مجھے اپنی طرف متوجہ کرتی رہتی تھی اور میں گھر آ کر دوسرے تیسرے اپنا آپ نرگس پہ انڈیلتا رہتا تھا۔

دس پندرہ روز نرگس میرے بلانے پر بھی ٹال مٹول کرتی رہی۔ ایک روز جب میں جبار سے نرگس کے حیلوں بہانوں کی وجہ سے بے حد اُلجھا تو وہ اس کے شوہر کو میرے پاس لے کر آ گیا۔ سرمہ بھری چپکیلی آنکھوں بڑے بڑے پٹوں اور گردن میں سیاہ ڈوری سے بندھے تعویزوں والا وہ مشٹنڈا کافی چالو انسان لگ رہا تھا۔ سر جھکا کے بیٹھتے ہی اس نے اپنے پاؤں میں پہنا پرانا کھسہ اُتارا اور زمین پر بیٹھ کر میرے ہاتھ میں دے کر روتے ہوئے کہنے لگا ''مجھے مار دو ''جوناب'' میں بے غیرت اور دلا ہوں۔ میں نے لالچ کی خاطر اپنی حوروں جیسی بے داغ بیوی کو ذلیل کیا۔ ملازمت ملتی بھی نہیں۔ ملے بھی تو پانچ چھ ہزار میں پیاز روٹی نہیں چلتی۔ آپ مہربان ہیں، نیک انسان ہیں۔ مجھے اپنے ہاتھوں سے مار دیجیے۔ میں نے اُسے دلدل میں گرا دیا ہے۔''

''اچھا اچھا واویلا بند کرو۔ اگر اب تم نے نرگس کو سنبھال لیا ہے اور سیدھے رستے پر چل پڑے ہو تو اچھی بات ہے۔ وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ تمہاری محبت میں لٹا رہی تھی وہ اپنی عزت۔''

''لیکن جناب...... اب تو وہ بالکل ماری گئی ہے جناب۔ آپ کی احسان مند ہے لیکن اتنا بوجھ اکیلی اُٹھانے جوگی نہ وہ ہے نہ میں بے غیرت۔''

''کہنا کیا چاہتے ہو؟ کیا بات ہے جبار؟''

''جناب ہم لوگ تو ہیں ہی نرے جاہل، آپ نے بھی کوئی احتیاط نہ کی۔ ہم جاہل کی کمین اب جب اس کے مفلس ناکارہ بدن میں آپ کی نسل کی جاگ لگ گئی ہے تو وہ جناب کی اولاد کو پیدا کر کے کس ماحول اور آمدن سے پالے گی۔ گابھن کی تو بازار میں بھی دوآنے کی ساکھ نہیں رہتی۔

میرے قدموں تلے کی زمین شق ہوگئی۔ اڑا اڑا دھم۔ میں نے جبار سے کہا ''یہ شخص بکواس کر رہا ہے۔ جھوٹ بول رہا ہے۔ فراڈ ہے میرے بدن میں افزائش نسل کی خصوصیت موجود ہی نہیں ہے۔''

''حضور نہیں...... اس کمبخت کو آپ کے پاس لانے کی کبھی جرات نہ کرتا۔ اسپتال میں خود اس کے اور اس کی بیوی کے ساتھ گیا۔ اس کے حمل کا تیسرا مہینہ چل رہا ہے۔''

''لیکن میرے بدن میں اولاد پیدا کرنے کے جرثوے نہیں ہیں۔ یہ اسی مشٹنڈے کی کرنی ہے۔''

''ایسی تو ''جوناب'' ہم نے کبھی بات ہی نہیں سنی کہ بندہ چنگا بھلا مرد ہو لیکن اولاد نہ پیدا کر سکے۔ دیکھیں میں نرگس کو اور بچے دونوں کو سنبھال لوں گا لیکن آپ کی حیثیت اور درجے کی اولاد میری آمدن میں پلے یہ ممکن نہیں ہو سکتا یا تو آپ مجھ سے طلاق دلوا کر نرگس کو نکاح میں لے آئیں یا پھر باقی زندگی اپنے بچے کی دیکھ بھال کا ذمہ اُٹھائیں۔''

''تم دھوکہ باز ہو، بے ایمان ہو۔ وہ بچہ میرا نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ ناممکنات میں سے ہے۔''

''ٹھیک ہے جوناب میرے ایس ایچ او چاچا بے قصوروں سے بھی جرم کا اعتراف کرانا جانتے ہیں اور یہ تو ان کے بھتیجے کی عزت اور زندگی موت کا معاملہ ہے۔ اس بے غیرت عورت کی بھی ایک بار چھترول ہوگئی نا تھانے میں تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔''

شہر کا مشہور وکیل عزیز احمد میرا پھوپھی زاد تھا۔ اس نے کہا یہاں قانون اور انصاف نام کی کوئی چیز موجود نہیں۔ سب مل جل کر تمہیں برسوں ایک پاؤں پہ کھڑا رکھیں گے۔ لاکھوں بٹورتے رہیں گے۔ پورے شہر میں تمہاری تھوڑی ہوگی۔ تمہاری جڑیں دنیا کے طاقت ور ترین ملک میں ہیں۔ میری مانو اور اس کھچ کھچ میں مت پڑو اور واپس اپنی جنم بھومی چلے جاؤ۔''

''میں نے تو ماں سے ملتے وقت بھی اُسے نہیں بتایا کہ شاید اب میں دوبارہ آپ کو کبھی نہ دیکھ سکوں۔''

رات کے دو بج رہے ہیں۔ جہاز موسموں کی اتھل پتھل کی وجہ سے بادلوں میں پھنسا ہوا ہے۔ نیچے اٹلانٹک کی غصیلی لہریں منہ سے جھاگ اُڑا رہی ہیں۔ سہمے سہمے مسافر جہاز کی دھیمی روشنی میں کمبل اوڑھے اٹھ کر بیٹھے منہ میں بار بار خیریت سے منزل تک پہنچنے کی دعائیں مانگ رہے ہیں۔ اپنے خواہشوں سے سنے بدن کی کرنیوں کی بھگتن بھگتتا میں واپس اپنی جنم بھومی کی طرف مڑ رہا ہوں۔ نہیں جانتا وہاں میں ایک صراط مستقیمی زندگی گزار سکوں گا یا میرا اچھوت بدن مجھے کسی ''برموڈا ٹرائی اینگل'' میں گرا کر دم لے گا۔

❀❀❀

افسانہ

تیز قدم

نیلم احمد بشیر

شام کو باقاعدگی سے واک کرنا میری ایک بہت پرانی عادت ہے۔ اپنی گلی میں شام کو آدھ پون گھنٹہ روزانہ چہل قدمی ضرور کر لیتی ہوں۔ صحت کا خیال، تفریح، ہوا خوری ہو جاتی ہے تو اچھا محسوس ہوتا ہے۔ اب تو یہ عادت میرے معمولات میں شامل ہو چکی ہے۔ جس گلی میں میرا گھر ہے وہ کافی پرسکون ہے۔ لوگ بھی مناسب سے ہیں۔ اس لیے مجھے کبھی کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی۔ ویسے ہمسایوں کے بارے میں یہ رائے تبھی قائم کی جا سکتی ہے جب ان سے اعتدال سے ملا جائے۔ نہ کسی کے گھر زیادہ آؤ نہ جاؤ نہ انہیں بلاؤ تو تعلقات ٹھیک رہتے ہیں۔ کیونکہ وہ ایک مقررہ حد سے زیادہ آگے بڑھتے ہی نہیں۔ نہ کوئی گلہ نہ شکوہ فرمائش نہ فہمائش۔ مطالبہ نہ توقع، ایسا ہو تو کوئی مسئلہ نہیں ہوتا اس لیے میرا اپنے محلے میں وقت آرام سے گزرتا ہے۔

ہماری گلی میں ایک پلاٹ کافی عرصہ سے خالی پڑا تھا۔ جس میں اکثر لوگ اپنی گاڑیاں پارک کر لیا کرتے تھے۔ سال ڈیڑھ سال پہلے کی بات ہے دیکھتے ہی دیکھتے اس پلاٹ پر ایک گھر کی تعمیر شروع ہو گئی اور جلد ہی اس کے مالکان نے اس میں آ کر رہنا بھی شروع کر دیا۔ گھر کے باہر نام کی تختی بھی آویزاں ہو گئی۔ میں نے پڑھا ''میجر افتخار ریٹائرڈ'' اوہو! تو کوئی فوجی فیملی ہے۔ میں نے سوچا..... گھر آباد ہو گیا تھا۔ اکثر اس کے رہائشی، فیملی کے افراد آتے جاتے دکھائی بھی دینے لگے۔

میں نے غور کیا کہ میجر افتخار صاحب کو بھی شام کو گلی میں واک کرنے کا شوق تھا۔ اوہو..... میں نے کچھ کوفت محسوس کی۔ اب بھلا ایک گلی ایک وقت میں دو افراد کیسے واک کریں گے۔ اس گلی میں میرے سوا پہلے تو کوئی دیوانہ نظر نہیں آتا تھا مگر اب یہ صاحب؟ ان کا کیا علاج ہو کہ اس سے پہلے کہ میں اپنے جوگرز چڑھا کر گلی میں نکلوں وہ پہلے ہی تیز تیز قدموں سے گلی میں شروع سے آخر تک چکر لگانا شروع کر چکے ہوتے ہیں۔ میں تو انہیں کھڑکی میں سے دیکھ کر اندر ہی دبک جاتی۔ جب تک وہ اپنے گھر لوٹتے وقت ہی نکل جاتا اور میری واک کا پروگرام وہیں کا وہیں رہ جاتا۔ میں کر بھی کیا سکتی آخر گلی میرے ابا جان کی تو نہیں تھی۔ منطقی بات تو یہ تھی کہ ان کا بھی گلی پہ اتنا ہی حق تھا جتنا میرا۔ یہ بھی نہیں کہہ سکتی تھی کہ وہ کسی اور وجہ سے شام کو واک کیا کریں۔ کبھی کبھار اچانک اگر ہمارا گلی میں آمنا سامنا ہو بھی جاتا تو وہ نیچی نظریں کیے لاتعلقی سے پاس سے گزر جاتا۔ وہ کسی اپنے ہی دھیان میں گم نظر آتا تھا۔

''اچھا بھلا تو ہے، اسے بھلا اتنی واک کی کیا ضرورت ہے'' میں دل ہی دل میں سوچتی۔ جینز ٹی شرٹ میں ملبوس، سمارٹ، دبلا پتلا، چاق و چوبند ریٹائرڈ میجر ہر لحاظ سے فٹ اور چست دکھائی دیتا تھا۔ مگر شاید یہی اس کے سمارٹ ہونے کا راز تھا۔ بعض اوقات مجھے لگتا جیسے وہ میری پرائیویسی میں مخل ہو گیا ہے۔

اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی مگر میں نے میجر کے ساتھ اچھی خاصی دشمنی پال لی تھی۔ آخر یہ قریبی پارک میں کیوں نہیں چلا جاتا۔ میں سوچتی ہماری گلی کے قریب ہی تو اتنا خوبصورت پارک ہے۔ مجھے اس کا اپنی گلی میں واک کرنا اتنا کھٹکنے لگا کہ تنگ آ کر میں نے خود ہی پارک میں جا کر سرسبز خوبصورت ماحول میں واک سے لطف اندوز ہونا شروع کر دیا۔

چند ہفتوں بعد میں نے ایک عجیب بات محسوس کی۔ میجر نے بھی گلی میں واک کرنا چھوڑ دی تھی۔ یہ کیا؟ کیا مجھے ہی گلی سے بھگانا مقصود تھا؟ سمجھ نہیں آئی۔ کیا اس نے مجھ سے کوئی ضد لگائی ہوئی تھی۔ اب وہ بالکل آتے جاتے بھی نظر نہیں آتا تھا۔ میری روٹین تبدیل کرواتے ہی میجر صاحب کے کلیجے میں ٹھنڈ پڑ گئی ہو گی۔ میں نے دل ہی دل میں اسے کوسا۔ کچھ عرصے بعد میں نے پھر سوچا۔ یہ میجر کہاں چلا گیا۔ اس کے بیوی بچے تو اکثر کار میں آتے جاتے دکھائی دیتے ہیں۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی اکثر اس کے بارے میں سوچنے لگی۔ اس کے گھر والوں سے میری کوئی دوستی بھی نہیں تھی کہ ان سے جا کر پوچھتی۔ میجر صاحب کہاں ہیں؟ کہاں چلے گئے۔ میں دل ہی دل میں قیافے دوڑانے لگتی۔

''تو میرے حریف نے آخر میدان چھوڑ ہی دیا'' میں دل ہی دل میں سوچ کر مسکرا دی پھر سوچا فوجی ہے..... کیا خبر کہیں پوسٹنگ ہو گئی ہو۔ وزیرستان یا سوات چلا گیا ہو۔ جیسے حالات چل رہے ہیں اس میں تو ریٹائرڈ فوجیوں کو بھی واپس بلا لیا گیا ہے۔ طالبان سے لڑنے کے لیے ساری فوج صف آرا ہو چکی ہے۔ میجر بھی شاید کسی محاذ پر دشمنوں سے برسر پیکار ہو۔ میں اپنے تجسس میں خود ہی سوال اور خود ہی جواب سوچتی رہتی۔ رفتہ رفتہ میجر کو میں بالکل بھول

گئی۔اب میں نے دوبارہ حسبِ معمول گلی میں واک کرنا شروع کر دی اور اپنی فتح کے خیال سے مسرور رہنے لگی۔ایسا لگا جیسے میں نے کسی فوج کو میدان سے بھگا دیا ہو۔

کئی مہینے گزر گئے اور مجھے اس شخص کا خیال تک نہ آیا۔ایک روز میں گلی میں سے گاڑی سے اُتر کر گھر جا رہی تھی تو میجر کے گھر کے آگے ایک گاڑی رُکتی نظر آئی۔گاڑی میں سوار دو نوجوان ملازم لپک کر باہر نکلے اور سفید کرتہ شلوار میں ملبوس ایک بوڑھے کو باہر نکالنے کی کوشش کرنے لگے۔بوڑھا بہت لاغر نظر آ رہا تھا۔اس کی سفید داڑھی بے ترتیبی سے بڑھی ہوئی تھی اور آنکھیں گڑھوں میں دھنسی ہوئی تھیں۔اس سے چلا نہیں جا رہا تھا۔لہٰذا ملازموں نے اسے دونوں بازوؤں سے تھام رکھا تھا۔بوڑھے کی شکل کچھ کچھ میجر سے ملتی تھی۔میں نے اندازہ لگایا کہ یہ میجر کا باپ ہوگا۔

اوہ اب سمجھ میں آیا کہ میجر اتنے دن کہاں غائب رہا ہے۔یقیناً اپنے بیمار بوڑھے باپ کی تیمارداری کو یا اس کے گھر یا ہسپتال میں اس کے ساتھ رہ رہا ہوگا۔اسی لیے عرصے سے غائب تھا۔میں نے دل ہی دل میں کہانی کے گمشدہ ٹکڑے جوڑنے شروع کر دیے۔ہائے بے چارہ اپنے باپ کی وجہ سے پریشان رہا ہوگا۔شاید اس نے اصرار کیا ہو کہ میرا باپ آخری وقت میں میرے پاس ہی رہے اور اسی لیے ساتھ لے آیا۔کتنا اچھا فرمانبردار بیٹا ہے۔اپنے باپ کی خدمت کے لیے اسے اپنے گھر لے آیا ہے۔میجر کے لیے اب میرے دل میں ہمدردی کے جذبات پیدا ہو گئے۔بہر حال میجر اب بھی واک کے لیے کبھی گلی میں نظر نہیں آیا تھا۔کتنا اچھا انسان ہے، باپ کی خبر گیری کے لیے اس نے اپنی زندگی ہی پس پشت ڈال دی ہے۔پتہ نہیں بزرگوار اب کیسے ہوں گے۔

حالت تو اچھی نہیں لگی تھی۔میں یہی سوچتی رہی۔

چند ہفتوں بعد ایک روز اچانک میرے دروازے کی گھنٹی بجی۔شاید کسی کا کوئی ملازم ہو۔اکثر محرم ،شبرات یا کسی اور دن کبھی کبھار محلے والے کھانے کی کوئی چیز بھی بھیج دیا کرتے ہیں ی۔ میں نے دروازے پر جا کر پوچھا''کون''

''وہ جی میں نے اطلاع دینا تھی کہ میجر افتخار صاحب فوت ہو گئے ہیں۔باجی نے کہا ہے سارے محلے میں اطلاع کر دو۔''

میرے تو پاؤں تلے سے زمین ہی نکل گئی۔

''میجر صاحب فوت ہو گئے، کیسے کیا ہوا انہیں'' گھبرا کر میں نے ملازم سے پوچھا۔

''بیمار تھے جی'' ملازم کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔اسے اور گھروں میں بھی گھنٹی بجانے جانا تھا۔میرا دل درد سے بھر گیا۔''اب تو ہسپتال والوں نے بھی جواب دے دیا تھا اسی لیے گھر لے آئے تھے۔'' ملازم نے مختصراً بتایا اور چلا گیا۔میں تو ہل کر رہ گئی۔اوہ میرے خدا تو وہ بوڑھا، لاغر، ڈولتا شخص میجر کا باپ نہیں تھا۔یہ حقیقت گولی کی طرح مجھ سے آن کے لگی۔میں نے تو اسے پہچانا تک نہیں۔پینٹ شرٹ میں ملبوس اتنا فٹ شخص اور پھر اس کی وہ بدلی ہوئی ہیئت۔ایک دم مجھے یاد آیا۔لڑکھڑاتے ہوئے بوڑھے بیمار شخص کی اور میری نگاہیں پہلی اور آخری بار اُس روز ملی بھی تھیں۔ہائے اس کے دل پر کیا گزری ہوگی کہ اب میں کیسا ہو گیا ہوں اور یہ ہمسائی خاتون مجھے کس حال میں...... دیکھ رہی ہے۔مجھے حقیقت کا اندازہ ہوتا تو میں پاس چلی جاتی۔اس کا حال چال پوچھتی مگر مجھے تو کچھ خبر نہیں تھی۔

سارا محلہ میجر صاحب کے گھر افسوس کرنے کے لیے گیا۔قُل ہوئے، چالیسواں مگر مجھ میں ان کے ہاں جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔نہ جانے کیوں ایک شرمندگی، ایک پسپائی سی محسوس ہوتی تھی۔کسی احساسِ جرم نے میرے دل کو بوجھل کر دیا تھا۔مجھے رہ رہ کر میجر کی یاد آنے لگی۔ایک اجنبی شخص کو معلوم بھی نہ تھا کہ کسی نے اپنے دل میں اس کے خلاف ایک محاذ کھول رکھا ہے۔اس کی زندگی کی بساط اچانک یوں لپیٹ لی گئی تھی۔ابھی کل ہی تو وہ زور شور سے گلی میں دندناتا پھرتا تھا اور آج وہ کہیں بھی نہیں تھا۔ایک روز ان کے گھر کے آگے سے گزرنے لگی تو میجر صاحب کی بیگم دروازے میں کھڑی نظر آئیں۔میں بے اختیار ان کی طرف بڑھی اور ان کے گلے لگ کر رونا شروع کر دیا۔وہ بھی آبدیدہ ہو گئیں۔میں نے سوچا وہ شاید گلہ کریں گی کہ آپ افسوس کے لیے نہ آئیں مگر وہ کچھ نہ بولیں۔

''کیا ہو گیا میجر صاحب کو۔اچھے بھلے تو تھے؟'' میں نے بمشکل سوال کیا۔انہیں اچانک کینسر ڈائیگنوز ہو گیا تھا اور جب پتہ چلا تو بات بہت آگے بڑھ چکی تھی۔مگر وہ پُراُمید تھے کہ وہ مکمل طور پر صحت یاب ہو جائیں گے۔وہ بڑی مثبت سوچ والے آدمی تھے۔صابر و شاکر۔بس کہتے تھے جلدی سے ٹھیک ہو جاؤں۔ایک بار ڈاکٹر مجھے واک کی اجازت دے دیں تو پھر دیکھنا۔میں ان ڈاکٹروں کی تشخیص کو مات دے دوں گا۔بہت اچھے شوہر تھے افتخار۔مجھے تو اب اپنی زندگی میں دلچسپی ہی نہیں رہی۔مگر کیا کروں بچوں کے لیے تو جینا ہی ہے۔آپ اندر آئیں نا میں آپ کو ان کی تصویریں دکھاؤں۔وہ اصرار کرنے لگیں۔میرا جی چاہا ان سے پوچھوں میجر صاحب کی قبر کہاں ہے؟ میں اس پر ایک پھول رکھ کے آنا چاہتی ہوں مگر یہ سوچ کے چپکی ہو رہی کہ وہ سوچے گی......اسے کیا ہے؟

اب ہماری گلی میں شام کو کوئی بھی واک نہیں کرتا......میں بھی نہیں۔

افسانہ

تیسرا روز

شاہد جمیل

گرمیوں میں سردی کے کرنٹ اور بشنکر اور سردیوں میں ماتھے پر پسینے کی بوندوں کی وجہ سے میرے لئے تو وہ شخص ایک معمے کی صورت اختیار کر چکا تھا - ہم لوگ ایک ہی دفتر میں کام کرتے تھے جہاں ہمارے علاوہ درجن بھر اور لوگ بھی ملازم تھے جو سردیوں میں ھنڈیا کے ڈھکنے کی طرح اس کی پیشانی پر پانی کے موٹے قطروں اور گرمیوں میں اُس کی ٹھی ٹھی اور ٹھنڈ سے کانپتے ہاتھ پاؤں سے ہمہ وقت محظوظ ہوتے - یار لوگوں نے گرمیوں میں اس کا نام سردی اور سردیوں میں گرمی رکھ دیا تھا - پہلے پہل تو میں نے بھی دیگر احباب کے ساتھ مل کر اُس کی اُلٹ کیفیت سے بھرپور لطف اٹھایا مگر پھر جب کئی بار اُسے دس بارہ لوگوں کے بیچ تنہا ، اُداس اور خاموش پایا تو میری اپنی دلی حالت بھی غم واندوہ میں اُس کے مماثل ہوگئی - کچھ ہی دن پہلے دوستوں نے اُس سے ہنسی مذاق کیلئے اُس کی ایک اور خصوصیت کا پتہ لگایا تھا - اُن کے بقول موصوف سیدھے دفتر سے کسی دربار پر چلے جاتے ہیں اور رات گئے وہاں مفت کے کھانے پینے کی اشیاء سے لُطف اندوز ہونے اور الائچی اور راب والے حقے کے تمبا کو سے جی بہلاتے ہیں - اُس کی پہلی دو خصوصیات کی طرح مجھے اندر ہی اندر دوستوں سے یہاں بھی اختلاف تھا - میں نے کئی بار اُسے اپنے ساتھ کھانا کھاتے دیکھا تھا - دائیں ہاتھ کی چھوٹی اور اُس کے ساتھ والی انگلی سیدھی کر کے بڑی اور شہادت والی اُنگلیوں کو انگوٹھے پر دباتے ہوئے وہ بمشکل دو لُقمے کانپتے کانپتے منہ میں ڈالتا اور سامنے پڑی ترکاری کی پلیٹ اور روٹیوں کی چنگیر کو عجلت سے یوں دور دھکیل دیتا گویا وہ روٹی کو نہیں بلکہ روٹی اُسے کھانے لگی ہے - اس بات سے تو صاف ظاہر تھا کہ اُسے کھانے پینے کا کوئی شوق نہیں البتہ اُس کے ہونٹوں میں سلگتے پے بہ پے سگریٹوں سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ چھوٹی الائچی اور راب میں موہا تمبا کو اسے دربار لے گیا ہو-

میں نے اُس کے مزاج کو دیکھتے ہوئے اس سے راہ و رسم پیدا کرنے کی کوشش کی مگر بات سگریٹوں کے کھلے اور بے حجابانہ تبادلے سے آگے نہ بڑھ سکی - پھر میں نے بھی کچھ دفتری تکلف کے پیشِ نظر اور کچھ اخلاقی رکاوٹ کے باعث اُسے خواہ مخواہ کریدنا مناسب نہ سمجھا - جب آپ دل سے کسی کی قدر کرتے ہیں اور اس سے ہمدردی رکھتے ہیں تو اکثر اوقات آپ کو اس شخص سے بے تکلفی کیلئے زبان و بیان کی ضرورت نہیں پڑتی - ہمارے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا اور کچھ ہی عرصے میں اس نے اپنی چھوٹی چھوٹی ذاتی باتیں بھی مجھے بتانی شروع کر دیں - میں نے محسوس کیا کہ وہ اپنی بیوی اور بچوں کی بات پر اکثر روہانسا ہو جاتا - ایک دن خود ہی کہنے لگا کہ میری بیوی کو ہفتہ دس دن بعد پاگل پن کے دورے پڑتے ہیں - میں نے اسے کہا کہ ڈاکٹر کیا کہتا ہے تو کہنے لگا کہ وہ ڈاکٹر کے پاس جاتی ہی نہیں - اسے اپنی بیماری کا پتہ ہی نہیں الٹا وہ مجھے نفسیاتی مریض سمجھتی ہے - اس کے دوروں میں روز بروز شدت آتی جاتی ہے - ہر دورہ پہلے سے شدید نوعیت کا ہوتا ہے - دورے کے دوران وہ کوئی بھی چیز اٹھا کر سامنے والے کو دے مارتی ہے اور سامنے کون ہوتا ہے یا میں یا پھر میرے تین معصوم بچے - اُس نے بتایا کہ دورہ پڑنے کی کوئی بھی معمولی سے معمولی وجہ ہو سکتی ہے - دورے کے شروع میں وہ پہلے دو ہتڑوں سے اپنے آپ کو مارتی ہے، پھر بچوں کو حلال کرتی ہے اور پھر میری کمر کو مکوں اور گھونسوں کیلئے تیار پا کر اس وقت تک اس سے باکسنگ کرتی ہے جب تک کہ اس کے ہاتھ تھک نہیں جاتے - پھر بھی غصہ کم نہ ہو تو چھری اٹھا لاتی ہے اور پہلے خود کو اور پھر بعد میں چھری پکڑنے والے کو بے دریغ زخمی کرنے کی کوشش کرتی ہے - دو تین گھنٹے کی گھمسان کی جنگ کے بعد میں سگریٹ پھونک کر اور بچے سسک سسک کر جہاں جگہ ملے لڑھک کر سو جاتے ہیں-

میری اُس سے دوستی تو ہو ہی گئی تھی اور کچھ دکھ سکھ کی ساجھے داری بھی - چھ ماہ کی شدید گرمی کے بعد موسم اچھا ہو گیا تھا اور کاتک کی پچیس تاریخ کو ہمارے گاؤں کے ساتھ والے گاؤں میں عُرس کے موقعہ پر میلہ لگتا تھا-

میں بچپن سے اس میلے میں جاتا رہا ہوں- یہاں تک کہ شہر آنے کے بعد بھی اگرچہ وہاں شہر جیسی سینما اور تھیٹر کی جدید سہولیات بھی میسر نہ تھیں مگر میں شاید صرف لوگوں کو دیکھنے کیلئے وہاں چلا جاتا اور باقاعدہ طور پر سارا سال میلے کے دوبارہ انعقاد کا انتظار کرتا رہا - اس بار میں نے اُسے بھی اپنے ساتھ میلے میں جانے کی دعوت دی جو اس نے تجسس بھرے انداز میں قبول کر لی - میں نے اُسے ذرا لبھانے کیلئے یہ بھی کہا کہ چلو دو چار روز شہر کی گہما گہمی اور دفتر کی سردردی سے دُور قدرتی ماحول میں گذار کر آتے ہیں اور وہاں گنے چوسیں گے ، مکئی کے

پودوں سے بھٹے اتار کر کھائیں گے اور دیسی کم مصری مرغوں کا شوربہ پئیں گے - وہ تو جیسے ایکویریم کی مچھلیوں کی طرح تازہ ہوا کے بُلبلوں کا انتظار ہی کر رہا تھا، جھٹ میرے ساتھ جانے کیلئے تیار ہو گیا-

میلے میں پہنچتے ہی ہم نے بندر اور بندریا کا تماشا دیکھنا شروع کیا - تماشے کے آغاز ہی میں مجھے اس کی چوتھی خصوصیت کا علم ہوا - انہماک کے دوران وہ بے اختیار دل کی باتیں بڑ بڑاتا جاتا - بندریا سوٹی کی اوٹ سے چُھپ چُھپ کر بندر کو دیکھنے اور اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی - وہ بڑبڑایا ، بڑی کم ذات ہوتی ہیں یہ بدبخت، اس سے بچ کر رہنا بندر بھیا اس سے بچ کے رہنا - پہلے یونہی یہ پھنساتی ہیں ، ادائیں دکھاتی ہیں اور پھر چھاتی پر چڑھ کر بیٹھ جاتی ہیں - اب بندر اور بندریا کی منگنی اور ہتھ جوڑی ہو رہی تھی وہ بڑبڑایا ، بکواس کرتی تھی ، کہتی تھی تمہیں منگنی کی انگوٹھی کے نگینے کی طرح ہمیشہ ہمیشہ کیلئے دل میں سجا کر رکھوں گی ، تمہیں زمانے کی گرم ہوا بھی نہیں لگنے دوں گی ، تمہارا مان سمان رکھوں گی - اب بندر سہرا باندھ کر بندریا کو بیاہنے گیا ہوا تھا - وہ بڑبڑایا ، اپنی موت خرید رہا ہے بدبخت ، بڑا سمجھایا تھا تجھے مگر تمہیں پوٹلیوں میں خارش نکلنے ہی نہیں دے رہی تھی - لمبا پڑ گیا کم بخت شہوت کے آگے - دو گھڑی کی لذت سے تو بہتر ہے کہ --- اس نے اپنا جُملہ مکمل بھی نہیں کیا تھا کہ وفورِ جذبات اور غصے سے اس کے اوپر اور تلے کے دانت آپس میں کڑکڑا گئے - اب بندریا سسرال جا رہی تھی اور بندر اُس کے آگے آگے جھومتا جاتا تھا وہ بڑبڑایا ، لے جا بدقسمت اپنی موت آپ سہیڑ کر لے جا - سوراخ کرے گی یہ تیرے سر میں اور کیڑے ڈالے گی تیرے بدن میں - تماشا گر بندریا کو سسرال میں جا کر ساس سسر کی خدمت کی نصیحتیں کر رہا تھا - وہ بڑبڑایا ، آں ! خدمت نہ کرے گی یہ تو کچھ اور بھی کرے گی - گلا نہ دبا دے گی یہ کم ذات بڈھی بڈھے کا - بندریا بندر کے گھر پہنچتے ہی آدرسے غرور کے ساتھ سب سے الگ تھلک بیٹھ گئی اور اس نے اپنی تھالی باقی تھالیوں سے جدا کر لی - وہ بڑبڑایا ، میں نہ کہتا تھا کہ یہ فتنہ ہے فتنہ - یہ تو ایسا صنم ہے جو مارتا بھی ہے اور رونے بھی نہیں دیتا - اب ذلالت اٹھاؤ پیارے بندر عمر بھر کیلئے - وہ پوری توجہ اور ارتکاز کے ساتھ تماشا دیکھ رہا تھا اور اپنے شعور و لاشعور کی باتیں بڑبڑا رہا تھا اور میں پوری توجہ سے صرف اس کی بڑبڑاہٹ سن رہا تھا - میلے کے پنڈال کے بیچوں بیچ جوگیا رنگ کر پگڑی باندھے ایک سپیرا اپنی سپنی کو بین سے رام کرنے کی کوشش کر رہا تھا - بین میں سانس کا پورا زور لگانے کی وجہ سے اس کی پڑپڑی کی نسیں اور گلے کی رگیں پوری طرح تن گئی تھیں - سپنی کو پھنکارتے دیکھ کر میرے مہمان کے دل کا لہو ایک بار پھر کھول گیا وہ بڑبڑایا ، یہ بچے کھانی نسل ہے ، اس کو مار دے بدبخت ، اسے جلدی مار دے - یہی بین ایک چھوڑ اس کے سر پر ، کچل دے سر اس کا اپنی ایڑی کے تلے - مار دے اس کو نہیں تو یہ تجھے مار دے گی - کیسا دودھ کا برتن اٹھائے پھرتا ہے اس کیلئے سالا ! جیسے سانپ کی بچی کو میت بنالے گا - جب بھی اِسے موقع ملا یہ تجھے ہی ڈسے گی - اگر تو اس زہریلی کو نہیں مارتا تو میرا دل کرتا ہے کہ میں تجھے مار دوں - یہ تو اپنے انڈے بچے نہیں چھوڑتی تیرا کیا بھلا کرے گی - جا تیری بین کا ستیاناس ، جا تیری پٹاری کا ستیاناس ، آگ لگے تجھے اور تیری سپنی کو - وہ غصے سے اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ پا رہا تھا اور اس کی باچھوں سے جھاگ نکل رہا تھا جب میں اسے دھکیلتے ہوئے آگے لے گیا - میرے دونوں ہاتھوں کو وہ اپنے کاندھوں پر محسوس کرتے ہوئے ذرا ہوش میں آیا -

ہماری میلے کی اگلی آئٹم خوف و ہراس سے بھرپور جادوگرنی کا شو تھا - اُس نے مجھے اس شو میں جانے سے روک دیا ، کہنے لگا آؤ اُدھر چلتے ہیں وہ دیکھو موت کے کنویں کے آگے کتنے خوبصورت زنانے ناچ رہے ہیں - میں نے اُسے کہا کہ زنانوں کو چھوڑ اور میں اُسے زبردستی جادوگرنی کے شو میں لے گیا - یہ سٹل تصویریں تھیں جن میں روشنی اور ساؤنڈ کے ایفکٹ کو یکجا کر کے جادوگرنی کی ڈراؤنی شکلیں دکھا کر سسپنس اور تھرل پیدا کیا گیا تھا - میں نے دیکھا کہ میرا دوست اپنی کُرسی پر انتہائی بے چینی سے کروٹیں بدل رہا تھا - اس کا سارا جسم پسینے سے شرابور تھا اور آنکھوں سے وحشت کی چنگاریاں پھوٹتی تھیں - جیسے ہی جادوگرنی کے لمبے لمبے دانت نظر آئے اس نے اپنی آہنی انگلیوں سے اپنے گلے کو دبانا شروع کر دیا - یہاں تک کہ اس کی آنکھیں باہر نکل آئیں اور اس کے منہ سے کھانسی کی آوازیں اور رالیں بہنا شروع ہو گئیں - میں ہی کیا آس پاس بیٹھے کئی لوگ پریشان ہو گئے - میں نے جلدی جلدی اُسے سیٹ سے اٹھایا اور اُسے سہارا دے کر باہر لے آیا - اس دوران وہ پھر بڑبڑایا ، وہ مجھے مار دے گی ، وہ میرا گلا گھونٹ دے گی - وہ میرے بچوں کو بھی مار دے گی ، وہ ہم سب کو مار دے گی - وہ میرے جسم کو استری سے داغ دے گی - کہتی ہے اگر کسی کو کچھ بتایا تو سب کو سوتے میں ذبح کر دوں گی - اب تو اُسے ہفتہ دس دن کی بجائے ہر تیسرے روز دورہ پڑنے لگا ہے - کیا پتہ جب میں گھر جاؤں تو اس کا تیسرا روز ہو ، میں مر گیا میرے خدا ، میں جیتے جی مر گیا - میری تمام تر تسلی اور ڈھارس کے باوجود اس کا ہائے کرلاپ جاری تھا یہاں تک کہ ہم لوگ میلے سے بہت دور نکل آئے -

افسانہ

ٹرانسفر

شعیب صادق

اختر کو ملٹی نیشنل کمپنی میں کام کرتے کئی سال ہو گئے تھے لیکن جب سے اس کی ٹرانسفر کراچی ہوئی تھی وہ پریشان تھا کیونکہ اس کے والدین کراچی میں تھے۔ اختر ہر دوسرے مہینے کمپنی کا کوئی کام نکال کر کراچی آ جاتا۔ گھر سے بھی ہو آتا اور کمپنی کا کام بھی نمٹا لیتا۔

اب وہ تھک گیا تھا۔ کافی عرصے سے تبدیلی کروانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس کی شنوائی نہیں ہو رہی تھی۔ کئی بار اس نے ڈائریکٹر صاحب سے ٹرانسفر کی بات کی۔ وہ ہر بار ایک ہی بات کہتے تمہارا کیس ہیڈ آفس بھیج دیا ہے۔ فکر کی کوئی بات نہیں یا پھر اس کی بات ٹال دیتے۔ اختر کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کیا کیا جائے۔ اس کا ایک دل تو کرتا تھا کہ ملازمت ہی چھوڑ دے لیکن اسے یہاں ہر طرح کا آرام تھا۔ رہائش بھی کمپنی کی طرف سے ملی ہوئی تھی۔ اس بارے میں سوچ سوچ کر وہ بیمار ہو گیا تھا۔ آج صبح اُٹھتے ہی اس نے بیماری کی درخواست لکھی۔ روشنی کو دیتے ہوئے کہا جاتے وقت یہ درخواست ڈائریکٹر صاحب کو دے دینا۔ کہنا بھائی کی طبیعت خراب ہے آج دفتر نہیں آئیں گے۔ اس نے اختر سے درخواست لیتے ہوئے کہا جی اچھا اس کے بعد اس نے گھر کے ایک دو ضروری کام کیے۔ تیار ہو کر نیچے گلی میں آ گئی۔ گلی کی نکڑ پر رکشہ کھڑا تھا۔ وہ اس میں بیٹھ کر سیدھی اختر کے دفتر پہنچی۔ ڈائریکٹر صاحب موجود نہ تھے۔ جب وہ آئے تو ان کی سیکرٹری نے بتایا ایک لڑکی کافی دیر سے آپ کا انتظار کر رہی ہے۔ انہوں نے کہا اسے اندر بھیج دو۔ سیکرٹری نے کمرے سے باہر آ کر روشنی کو بتایا ڈائریکٹر صاحب بلا رہے ہیں۔

روشنی نے پرس سے آئینہ نکال کر اپنا چہرہ دیکھا۔ بڑی نفاست سے نئی لپ اسٹک لگائی اور مضبوط قدم رکھتی ہوئی ڈائریکٹر صاحب کے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس وقت وہ کسی فائل میں مشغول تھے۔ انہوں نے سر اوپر اُٹھایا۔ چند لمحے کے لیے وہ ساکت ہو کر رہ گئے نہ جانے یہ کیفیت کب تک ان پر طاری رہی۔ جب اس کی شخصیت کا اثر کم ہوا وہ چونکے۔

''آپ کب آئیں؟''

''جی میں تو ابھی آئی ہوں''

''تو آپ دروازے پر کیوں کھڑی ہیں۔ پلیز تشریف رکھیں۔''

جب وہ ان کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی تو انہوں نے کہا جی میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔

''مجھے درخواست دینی تھی''

''کیسی درخواست؟''

''اختر میرے بڑے بھائی ہیں۔ کل شام سے ان کی طبیعت خراب ہے۔ اس لیے انہوں نے یہ درخواست بھیجی ہے۔'' اس نے کاغذ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

اس سے پہلے کہ وہ درخواست پڑھتے انہوں نے روشنی سے کہا آپ کے ساتھ کوئی ہے۔ جی نہیں میں اکیلی ہی آئی ہوں۔ بہت خوب لڑکیوں کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ ان کے چہرے پر خوشی نمودار ہوئی۔ انہوں نے چائے کی پیشکش کی۔ اس سے پہلے کہ وہ نفی میں سر ہلاتی۔ انہوں نے گھنٹی دبا کر ملازم کو اندر بلایا۔

چائے لانے کے لیے کہا۔ تھوڑی دیر میں چائے آ گئی۔ وہ چائے کی چسکیاں لینے کے ساتھ ساتھ باتیں بھی کر رہے تھے۔ ان کی باتوں سے ایسا نہیں لگ رہا تھا کہ ان کی پہلی ملاقات ہے۔ وہ جانے لگی تو انہوں نے روشنی سے کہا کہ اگر آپ برا نہ مانیں تو آپ کی خیر و عافیت جاننے کے لیے آپ کو فون کرسکتی ہوں۔ اس نے کہا کیوں نہیں۔ اس نے جھٹ پر اپنا سیل نمبر لکھ کر ان کی طرف بڑھا دیا۔ پھر ہنستے ہوئے روشنی نے کہا نمبر تو میں نے دے دیا۔ آپ وقت بے وقت فون کر کے بور تو نہیں کریں گے۔

ڈائریکٹر صاحب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ غلطی کی ہے، اس کی سزا تو بھگتنا پڑے گی۔ پھر کیا تھا اس ملاقات کے بعد دن میں ایک دو دفعہ ضرور بات ہو جاتی۔

ایک دن روشنی بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی کہ فون کی گھنٹی بجنا شروع ہوئی۔ روشنی نے ریسیور اُٹھایا ور کہا ہیلو! دوسری طرف ڈائریکٹر صاحب بول رہے تھے۔روشنی ان کی آواز سن کر مسکرائی۔

آپ کی ہنسی بڑی پیاری ہے۔ ویسے آپ خود بھی بڑی پیاری ہیں۔ دل کرتا ہے وہ کہتے کہتے......خاموش ہوگئے۔

چند لمحے اسی طرح خاموشی میں گزر گئے۔ روشنی نے اس خاموشی کو توڑا اور کہا آپ کچھ کہہ رہے تھے۔ چھوڑو جانے دو۔ پھر روشنی نے پوچھا آپ اس وقت ہیں کہاں؟

انہوں نے جواب دیا آپ کے فلیٹ کے بالکل نیچے پارکنگ میں۔ واقعی روشنی نے حیرت سے کہا۔ پھر اُوپر آ جائیں میں گھر میں اکیلی بور ہو رہی تھی۔ بھیا کراچی گئے ہیں کل آئیں گے۔ اچھا فون رکھتی ہوں۔ اس سے پہلے وہ کوئی جواب دیتے روشنی نے ریسیور رکھ دیا۔

مارے خوشی کے ان کے حلق سے دبی دبی چیخ بلند ہوئی۔ اس عمر میں بھی وہ دو دو سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے اُوپر پہنچے۔ جہاں روشنی ان کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ ان کو اپنے ساتھ ڈرائنگ روم میں لے آئی۔

انہوں نے بیگ کو ایک طرف رکھا اور سامنے صوفے پر بیٹھ گئے۔ وہ ان کے برابر میں بیٹھ گئی۔

ڈرائنگ روم کی آراء میں اس کی نفاست جھلک رہی تھی۔ جس کی وجہ سے کمرے کا ماحول بڑا دلکش اور پرسکون معلوم ہو رہا تھا۔ ویسے بھی تنہائی میں ملنے کا پہلا موقع تھا۔ اس کے باوجود وہ تکلف برت رہے تھے۔ وہ نان سٹاپ بولے جا رہے تھے۔ روشنی ان کی باتیں خاموشی سے سن رہی تھی۔ باتوں میں ٹائم کا احساس نہ ہوا۔ اچانک روشنی نے کہا سوری میں تو باتوں میں کھانے کا پوچھنا ہی بھول گئی۔ آپ فریش ہو جائیں میں کھانا لگاتی ہوں۔ وہ فریش ہونے واش روم چلے گئے۔ جوں ہی وہ واپس آئے کھانا ٹیبل پر تیار تھا۔ دونوں نے کھانا کھایا پھر اٹھ کر ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ ادھر ادھر کی کافی باتیں ہوتی رہیں۔ جوں ہی وہ کسی کام سے اُٹھی انہوں نے ہمت سے کام لیا اور ڈرتے ہوئے اپنا ہاتھ اس کی کمر پر رکھ کر اسے قریب کرلیا۔ اس کے شیمپو کیے بالوں سے ہلکی ہلکی خوشبو آ رہی تھی۔ اچانک ان کی نظر اس کے گریبان پر پڑی تو اس کا دودھ جیسا چٹا بدن نظر آیا۔ ایک رات دوسری تنہائی۔ دعوت گناہ دے رہی تھی۔ وہ روشنی کو اٹھا کر کمرے میں لے آئے۔

جوں ہی انہوں نے اس کے سانسوں کا لمس محسوس کیا کپڑے تبدیل کیے بغیر بستر پر چلے گئے شاید وہ تھکے ہوئے تھے۔ لائٹ آف کردی۔ صبح جب ان کی آنکھ کھلی تو وہ روشنی کی آغوش میں تھے۔ ٹائم دیکھا تو کافی دیر ہو چکی تھی۔ انہوں نے اپنے کپڑے تلاش کیے۔ روشنی کو سوتا چھوڑ کر واش روم میں گھس گئے۔ انہوں نے جلدی جلدی شاور لیا۔ ناشتہ کیے بغیر دفتر چلے گئے۔ دفتر آتے ہی انہوں نے چپڑاسی سے اختر کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بتایا اختر صاحب ابھی تک نہیں آئے۔ سر وہ کچھ عرصے سے ذرا لیٹ ہی آتے ہیں۔

انہوں نے غصے سے اس کی طرف دیکھا اور کہا ادھر ادھر نظر رکھنے کی بجائے اپنے کام پر توجہ دیا کرو۔

سوری سر! اچھا اب تم جاؤ۔ وہ کمرے سے باہر آ گیا۔ یہ اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ اختر جوں ہی دفتر پہنچا اس نے ابھی کام شروع نہیں کیا تھا۔ چپڑاسی نے آ کر بتایا صاحب صبح سے آپ کا پوچھ رہے ہیں۔ اس نے ہاتھ سے بالوں کو ٹھیک کیا۔ ڈرتے ڈرتے ڈائریکٹر صاحب کے کمرے میں داخل ہوا۔

انہوں نے اپنا سر اُوپر اُٹھایا اور بولے مسٹر اختر آپ کو ذرا زحمت دینی پڑ رہی ہے۔ کل صبح گیارہ بجے ایک امریکی وفد آ رہا ہے۔ صبح ایئرپورٹ چلے جایئے گا اور ان کے لیے پانچ ستارا ہوٹل میں کمرے بک کروا دیجیے گا۔ میں بھی ضروری کام نمٹا کر ہوٹل پہنچ جاؤں گا۔ ان کی خدمت میں کسی قسم کی کوئی کسر نہیں رہنی چاہیے۔ جب تک وہ یہاں ہیں آپ کو ان کی ہر ضرورت کا خیال رکھنا ہے۔ یہ بڑی اہم ذمہ داری ہے۔ مجھے پتہ ہے آپ شکایت کا موقع نہیں دیں گے۔

لیس سر......

آپ اس وقت جائیں جا کر تیاری کریں اور کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے کال کر دیں۔ انہوں نے کارڈ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا جس میں ان کے ذاتی نمبر درج تھے۔ جوں ہی اختر کمرے سے باہر گیا۔ انہوں نے روشنی کو فون کیا۔

ہیلو روشنی! میری جان اس وقت کیا کر رہی ہو۔ اس نے جواب دیا میں ویسے ہی بیٹھی تھی۔

آپ بتائیں بڑے چہک رہے ہیں۔

انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا تمہارے بھائی کو دو تین دن کے لیے مصروف کر دیا ہے۔ آج رات کو میں تمہاری طرف آ رہا ہوں۔ وہ مسکرائی! اچھا آپ کی بیوی۔ انہوں نے کہا اسے پتا ہے کہ غیر ملکی مہمان آ رہے ہیں اس لیے دو تین دن کے لیے باہر رہنا ہے۔ اب میں فون رکھتا ہوں۔ شام کو ملاقات ہوگی۔

شام کو انہوں نے گاڑی گھر بھیج دی۔ خود ٹیکسی پکڑی روشنی کو ملنے چلے گئے۔ وہ ان کو دیکھ کر بڑی خوش ہوئی۔

آپ واقعی باس ہیں۔ تمام معاملات کو بڑی خوش اسلوبی سے ہینڈل کیا ہے۔ پھر کیا تھا رات کی تنہائی، نشے اور دیوانگی کے عالم میں گزاری۔

صبح ناشتے کی ٹیبل پر روشنی نے کہا۔ دیکھیں ہم اس طرح کب تک ملتے رہیں گے۔ آپ بھائی کی ٹرانسفر کروا دیں۔ پھر ہم ہوں گے اور یہ تنہائی۔ لمبی راتیں تصور کریں۔ یار یہ تو کوئی بڑی بات نہیں۔ یہ ذرا ان مہمانوں سے نمٹ لوں۔ پھر تمہارے بھائی کی ٹرانسفر کراچی کروا دوں گا۔ روشنی نے کہا مسئلہ تو پھر وہیں رہے گا۔

مجھے ان کے ساتھ جانا پڑے گا۔ آپ کوشش کر کے بھائی کی ٹرانسفر کسی دوسرے ملک کیوں نہیں کروا دیتے۔ آج ان کا فون آیا تھا۔ بتا رہے تھے جو غیر ملکی مہمان آئے ہیں ان کو کچھ لوگ چاہئیں۔ دعا کرو میرا نام بھی آ جائے۔ کہہ تو ٹھیک رہا ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ میں ایک بندے کا نام دے سکتا ہوں۔ اس کے لیے میں نے اپنے سالے کا نام دیا ہے۔ کہتے ہیں ساری خدائی ایک طرف جورو کا بھائی ایک طرف۔

روشنی یہ سن کر ناراض ہوگئی۔ میں آپ کی کچھ نہیں...... رات کو میں نے بات اس لیے نہیں کی۔ کیونکہ مرد کا بستر پر کیا ہوا وعدہ پائیدار نہیں ہوتا۔

یار بیوی کو بھی جواب دینا ہے۔ اچھا ایسی بات ہے تو جائیں بیوی کے پاس۔ اس نے غصے سے کہا۔

انہوں نے کہا تم ویسے ہی ناراض ہوتی ہو۔ میں کچھ کرتا ہوں۔ کرتا ہوں نہیں وعدہ کریں۔ اگلی دفعہ آئیں تو Appointment letter اور ٹکٹ آپ کے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔

اچھا میری جان..........

پھر انہوں نے روشنی کے ساتھ ناشتہ کیا۔ ہوٹل چلے گئے۔ جب تک غیر ملکی مہمان رہے ان کا یہی معمول رہا۔

اختر بھی ان مہمانوں کی دیکھ بھال میں مصروف رہا۔ جب اختر تین چار دن کے بعد دفتر آیا کسی نے بتایا کہ باس نے یاد کیا ہے۔

جب اختر کمرے میں داخل ہوا انہوں نے نظریں اُٹھائے بغیر کہا۔

مبارک ہو اختر!

مبارک! اختر کو کچھ سمجھ نہ آئی۔

نہیں سر یہ تو میرا فرض تھا۔

وہ مسکرائے...... بھئی تمہارا ٹکٹ آ گیا ہے۔

ٹکٹ کیسا ٹکٹ...... سر میں آپ کی بات سمجھا نہیں۔

بھئی امریکہ کے لیے تمہارا انتخاب ہو گیا ہے۔ گھر جاؤ جا کر پیکنگ کرو۔ کل تمہاری فلائٹ ہے۔ میں نے ڈرائیور سے کہہ دیا ہے وہ تمہیں گھر چھوڑ آئے گا۔ کل ایئرپورٹ پر ملاقات ہوگی۔ وہ ان کا شکریہ ادا کر کے گھر آ گیا۔

اگلی صبح جب اس کے باس ایئرپورٹ آئے تو اختر اور روشنی ان کا انتظار کر رہے تھے۔ جب وہ ان سے مل کر اندر جانے لگا تو اس کی آنکھوں سے تشکر کے آنسو بہہ نکلے۔ اس نے آنکھیں صاف کرتے ہوئے کہا سر آپ کے مجھ غریب پر بڑے احسانات ہیں۔ آپ ایک آخری مہربانی کر دیں۔ روشنی کو گھر ڈراپ کر دیں۔ کیوں نہیں تم بے فکر ہو کر جاؤ۔ میں اسے ڈراپ کر دوں گا۔ اختر نے روشنی کو کچھ روپے دیے۔ پھر خدا حافظ کہہ کر اندر چلا گیا۔ یہ ایئرپورٹ سے باہر آ گئے۔ ڈائریکٹر صاحب آج بڑے خوش تھے ان کے راستے کا آخری پتھر بھی ہٹ گیا تھا۔ وہ آ کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ جب گاڑی مال روڈ سے گزر رہی تھی انہوں نے روشنی سے کہا۔ ڈارلنگ مجھے دفتر میں ضروری کام ہے۔ میں شام تک آ جاؤں گا۔ تم نے کہاں جانا ہے۔ روشنی نے بڑے پیار سے جواب دیا گھر...... انہوں نے گھر جانے کے لیے جونہی گاڑی موڑی روشنی نے بڑے نرم و نازک لہجے میں کہا وہاں نہیں ہیرا منڈی۔ وہ گھبرا گئے...... تم کیا کہہ رہی ہو۔ اس کے ہونٹوں پر دلفریب مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ ہاں میں وہاں رہتی ہوں۔ میرا کام ختم ہوگیا۔ یہ میرا کارڈ ہے رکھ لیں۔ اگر زندگی میں کبھی میری ضرورت پڑی تو میں آپ کی بھی بہن بن جاؤں گی۔

افسانہ

محبت

راحت و

لوگ کہتے ہیں محبت دانت کے درد کی طرح ہوتی ہے۔ دانت کے درد میں پورا وجود درد بن جاتا ہے۔ اس درد کے علاوہ کوئی احساس باقی نہیں رہتا۔ مگر جب درد کا آرام آ جاتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے کبھی درد ہوا ہی نہیں تھا۔

اسی طرح جب محبت ہوتی ہے تو اس کے احساس کے علاوہ کوئی اور احساس نہیں ہوتا اور جب یہ محبت دم توڑ دیتی ہے یا نفرت میں بدل جاتی ہے تو یوں لگتا ہے جیسے محبت کبھی ہوئی نہیں تھی۔

مگر میں کہتی ہوں مرد کی محبت دانت کے درد کی طرح ہوتی ہے۔ مرد جب محبت کرتا ہے تو شدت سے کرتا ہے اور اس کی محبت جب ختم ہوتی ہے تو یوں لگتا ہے جیسے اُس نے کبھی محبت کی ہی نہیں تھی۔

عورت کی محبت سر درد کی طرح ہوتی ہے۔ سر کا درد جب ہوتا ہے تو سارے وجود میں شامل ہو جاتا ہے۔ لمحہ لمحہ سر کا درد بڑھتا چلا جاتا ہے اور سارا جسم بے سکون ہو جاتا ہے اور جب سر کا درد ٹھیک ہوتا ہے تو بھی بہت دیر تک سارا وجود مضمحل رہتا ہے۔ سر کا درد ختم ہونے کے بعد بہت دیر تک اپنے ہونے کا احساس دلاتا رہتا ہے۔ اسی طرح جب عورت محبت کرتی ہے تو جسم و جان کی شدت سے کرتی ہے اور محبت کے علاوہ اسے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ جب ختم ہو جاتی ہے تو عورت بہت عرصے تک محبت کو نہیں بھول پاتی۔ محبت کا احساس اسے عمر بھر نہیں بھولتا۔ وہ اسی کیفیت میں زندگی گزار دیتی ہے۔

میں نے بھی محبت کی تھی۔ اس وقت میں سولہ سال کی تھی۔ سولہ سال کی عمر بہت خوبصورت ہوتی ہے۔ یہ وہ عمر ہوتی ہے جب ہر چیز نئی اور دلکش لگتی ہے۔ بارش میں بھیگنا اور بھیگا ہوا دوپٹہ نچوڑنا بہت دلفریب لگتا ہے۔ جب پھول، ہوا اور راستے اور منظر بہت منفرد لگتے ہیں۔ کچی عمر کی پہلی محبت بارش کی طرح ہوتی ہے۔ جو جسم و جاں کو بھگو دیتی ہے۔

اس کا نام طیب تھا۔ ہمارے محلے کی مسجد کے امام صاحب ملتان کے علاقے سے آئے تھے اور ہمارے محلے میں ہی رہتے تھے۔ ان کے بیوی بچے ملتان میں ہی تھے۔ مسجد کے ساتھ بنے چھوٹے سے کمرے میں ان کی رہائش تھی۔ محلے کے مختلف گھروں سے ان کے لیے صبح شام کھانا جاتا تھا۔ محلے کے بچوں کو وہ مسجد میں قرآن پاک پڑھایا کرتے تھے۔ مگر ہمارے گھر وہ پڑھانے کے لیے خود آتے تھے۔ میں اور میرا چھوٹا بھائی دونوں ان سے قرآن پاک کا سبق لیا کرتے تھے۔ ابا ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ ان کے حکم کے مطابق رات کا کھانا ہمارے گھر سے جانے لگا۔ وہ مغرب کی نماز پڑھا کر کسی بچے کو کھانا لینے کے لیے بھیجتے تھے۔ امی ٹرے میں کھانا رکھ کر مجھے پکڑا دیتی تھیں جو میں دروازے پر جا کر بچے کو دے دیتی۔ آہستہ آہستہ یہ میری ذمہ داری بن گئی کہ میں وقت پر مولوی صاحب کے لیے ٹرے میں کھانا تیار کر دیتی۔

ایک شام مغرب کے بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے کھانے کی ٹرے اُٹھائی اور دروازے پر آ گئی۔ دروازہ کھولا تو سامنے ایک جوان لڑکا کھڑا تھا۔ نظریں جھکائے ہوئے بولا ابا جان نے کھانا منگوایا ہے۔

تم کون ہو؟ میں نے پوچھا۔

جی...... میں مولوی عبدالعزیز صاحب کا بیٹا ہوں اور ملتان سے آیا ہوں۔ وہ ویسے ہی نظریں جھکائے ہوئے بول رہا تھا۔ اس نے ایک بار بھی نظر اُٹھا کر میری طرف نہیں دیکھا تھا۔ میں نے ٹرے اسے پکڑائی وہ چلا گیا۔ میں کتنی دیر وہاں کھڑی رہی۔

وہ رات پہلی رات تھی جو میں نے جاگ گزاری۔ سرخ و سفید رنگت والا وہ خوبصورت لڑ میرے ''رت جگے'' کی وجہ تھا۔ وہ بہت خوبصور تھا۔ سیاہ بال اُس کی پیشانی پر بکھرے ہوئے تھے مجھے پہلی نظر میں اس سے محبت ہو گئی تھی۔ اگلے دا میں نے صبح ہی سے انتظار شروع کر دیا۔ شام کو وہ پ دروازے پر تھا۔

تمہارا نام کیا ہے۔ میں نے پوچھا۔

طیب ہے میرا نام۔

پڑھتے ہو؟

جی...... میٹرک کر کے یہاں آیا ہوں۔ اب مزید تعلیم حاصل کروں گا۔ اس نے بتایا۔

انداز وہی تھا۔ نظریں نیچے کیے مجھے غصہ آ لگا۔ یہ میری طرف دیکھ کر بات کیوں نہیں کرتا۔

جی...... کھانا دے دیں۔ اس نے کہا۔

یہ لو۔ میں نے ٹرے اسے پکڑائی وہ چلا گیا۔

محبت کی ایک ان دیکھی آگ میں میرا وجو جل رہا تھا۔ بہت سے دن گزر گئے۔ کبھی میں ایس بات کرتی جس پر وہ صرف لمحہ بھر کے لیے نظریں اٹ کر مجھے دیکھتا پھر نظریں جھکا لیتا۔

پھر میں نے اسے خط لکھنے کا فیصلہ کیا اور کاغذ پ اپنا دل نکال کر رکھ دیا۔ اپنی محبت کا اقرار کیا۔ اس کی بے نیازی اور بے رُخی کا شکوہ لکھا۔ اس کے بغیر م جانے کا دعویٰ کیا اور اسے ہر صورت میں حاصل کر کی خواہش لکھی۔ ٹی وی کے ڈراموں اور رسالوں میں سے یہ بات میں نے پڑھی تھی کہ محبوب کو رومال کا تحف دیتے ہیں۔ میں نے سفید رنگ کے ایک خوبصورت رومال پر سرخ رنگ کے دھاگے سے اپنے اور اس کے نام کے پہلے حرف T اور R کاڑھے۔ موٹا سا ایک دل

جس میں تیر پیوست تھا وہ بھی دھاگے سے بنایا۔ خط کو رومال میں رکھا اور شام کا انتظار کرنے لگی۔

شام کو کھانا ٹرے میں رکھا۔ رومال کو بہت احتیاط سے روئی والے رومال میں لپیٹ دیا۔ ٹرے اس کی طرف بڑھاتے ہوئے میں نے کہا۔

طیب! اس ٹرے میں تمہارے لیے ایک امانت ہے۔ وہ دیکھ لینا اور کل مجھے اس بات کا جواب دینا جو میں نے پوچھی ہے۔ اس نے ایک نظر میری طرف دیکھا اور بغیر کچھ کہے ٹرے پکڑی اور پلٹ گیا۔

مجھے یقین تھا کہ محبت کا جواب صرف محبت ہی ہوسکتا ہے۔ اگر میں نے لڑکی ہو کر پہل کی ہے تو وہ تو مرد ہے۔ پیچھے ہٹ ہی نہیں سکتا۔ میں انتظار کرنے لگی اور میرا انتظار انتظار ہی رہا۔

اگلے دن مسجد سے کوئی کھانا لینے نہیں آیا اور مولوی عبدالعزیز صاحب ہمیں پڑھانے بھی نہیں آئے۔ اگرچہ میں قرآن پاک پڑھ چکی تھی پھر بھی وہ روزانہ مجھ سے سنتے تھے اور چھوٹا بھائی تو ابھی پڑھ رہا تھا۔

ایک دن، دو دن اور پھر پانچ دن گزر گئے۔ طیب کا کوئی پتہ نہ چلا۔ چھٹے دن مولوی صاحب آ گئے۔ امی کے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ وہ اپنے بیٹے طیب کو ملتان چھوڑنے گئے تھے۔ وہ لاہور آیا تو مزید تعلیم کے لیے تھا مگر اچانک اُس نے واپسی کی ضد لگائی اور میں مجبوراً اُسے چھوڑ آیا ہوں۔ وہیں پڑھے گا اور ساتھ کوئی کام بھی سیکھ لے گا۔

مجھ پر تو جیسے بجلی گر پڑی۔ اس رات مجھے پھونک کر بخار چڑھا۔ اگلے ماہ میرے میٹرک کے سالانہ امتحانات ہونے والے تھے۔ میں اس قدر بیمار ہوگئی کہ مجھے ہاسپٹل داخل کرانا پڑا۔ گھر والے پریشان تھے اور میرا دکھ ہی نہ جاتا تھا۔ میری پہلی محبت کی اتنی ناقدری۔ میرے دل کی کلی کھلنے سے پہلے ہی مرجھا گئی۔ امتحان میں نے بڑی مشکل سے دیا۔ میرے دل سے وہ نکلتا ہی نہیں تھا۔ جیسے تیسے پیپر دیے اور بمشکل ہی پاس ہوئی۔ ایک عام سے کالج میں فرسٹ ایئر میں داخلہ لے لیا۔ وقت کچھ آگے بڑھا۔ دل کو جیسے قرار آنے لگا اور پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ میں طیب کو بھول گئی۔ زندگی کے آنے والے رنگ بہت حسین تھے۔ اب تو کبھی یاد بھی آتا تو اپنی بے وقوفی پر ہنسی آتی تھی۔

بی اے کرتے ہی میری شادی ہوگئی اور میں بیاہ کر کراچی آ گئی۔ نیا اور روشنیوں سے بھرا شہر۔ محبت کرنے والا ہم سفر۔ اگلے پانچ سال میں میری گود میں دو بچے بھی آ گئے۔ زندگی مکمل ہوگئی۔ سال دو سال بعد لاہور کا چکر لگتا۔ اتنا فاصلہ تھا کہ جلدی جلدی جانا ممکن نہ تھا۔ میرے شوہر راشد بہت اچھے انسان تھے۔ شادی کو دس سال کا عرصہ گزر گیا تھا کہ میرے ابا بہت سخت بیمار ہوگئے۔ انہیں دل کا اٹیک ہوا تھا۔ میں راشد کے سامنے رو پڑی۔ بیٹیاں کتنی بھی خوش ہوں سسرال میں ان کا دل میکے سے بندھا رہتا ہے۔ بچوں کے سالانہ امتحان ہونے والے تھے۔ راشد نے کہا بچوں کو میں سنبھال لوں گا تم اپنے ابا کے پاس جاؤ اور یوں میں اپنے بیمار باپ کے پاس آ گئی۔ عرصے بعد میکے کی فضا میں سانس لیا۔

ابا کی حالت سنبھل رہی تھی۔ ہاسپٹل سے گھر شفٹ کر دیا گیا تھا۔ میں دن رات ان کی خدمت میں لگی رہتی تھی۔ محلے والے، ملنے جلنے والے سب عیادت کے لیے آ رہے تھے۔

ایک شام امی مغرب کی نماز سے فارغ ہو کر ابا کے پاس بیٹھی تھیں۔ میں باورچی خانے میں تھی۔ دروازے پر دستک ہوئی۔

رابعہ......امی نے آواز دی۔

مسجد سے بچہ آیا ہوگا کھانا دے دو۔ میں نے کھانا ٹرے میں رکھا اور دروازے پر آ گئی۔ دروازہ کھولا سامنے ایک مولوی کھڑا تھا۔ سیاہ داڑھی والا مولوی تھا۔ شاید مسجد میں کوئی نیا امام آیا تھا۔

سلمان صاحب گھر پر ہیں؟ اس نے بڑی شائستگی سے پوچھا۔

جی ہاں۔ میں نے ٹرے پیچھے کر لی۔

میں ان کی عیادت کو حاضر ہوا تھا۔

آپ آیئے۔ میں نے راستہ دیتے ہوئے کہا اور واپس جانے کے لیے مڑی۔

رابعہ بی بی! میری بات سن لیں۔ میں اس کے منہ سے اپنا نام سن کر حیران رہ گئی۔

یہ آپ کی امانت ہے میرے پاس۔ اس نے ایک سفید کپڑا میری طرف بڑھایا شاید رومال تھا۔ میں نے پکڑ کر اُسے دیکھا۔ رومال کا سفید رنگ مٹیالا ہو چکا تھا۔ کونے میں سرخ دھاگے سے کاڑھے گئے حرف R.T نمایاں تھے اور تیر والا دل بھی۔ ادراک کے در وا ہوئے اور مجھے یاد آیا وہ طیب تھا۔ مولوی عبدالعزیز کا بیٹا۔ میری کچی عمر کی پہلی محبت جو میرا اظہار، میری چاہت چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ میں نے اس کا چہرہ دیکھا۔ اس نے نظریں اُٹھائیں۔ مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

رابعہ بی بی! سالوں سے میں نے آپ کی امانت سنبھال کر رکھی تھی۔ آپ کا خط میں نے اسی دن پھاڑ دیا تھا۔ میں گم صم اسے دیکھتی رہی۔ اس سے یہ بھی نہ پوچھ سکی کہ بزدلوں کی طرح کیوں بھاگا تھا۔ ہم آپ کے گھر کا نمک کھاتے تھے اور اب بھی کھاتے ہیں اور محسن سے دغا کرنا کمینے لوگوں کا کام ہے اور وہ ذرا سا رُکا۔

باقی رہی بات دل کی تو دل پر بھلا کس کا اختیار ہوا ہے۔ وہ تو کسی کی مانتا ہی نہیں۔ اس کا لہجہ ٹوٹ سا گیا اور وہ میرے قریب سے گزر کر ابا کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

میں رومال ہاتھ میں پکڑے وہیں کھڑی تھی۔ لوگ کہتے ہیں محبت دانت کے درد کی طرح ہوتی ہے مگر میں کہتی ہوں مرد کی محبت دانت کے درد کی طرح ہوتی ہے شدید اور وقتی اور عورت کی محبت سر درد کی طرح ہوتی ہے۔

آپ کیا کہتے ہیں؟

متفرق شاعری

جتنے ڈر کھلتے ہیں
اُتنے در کھلتے ہیں
جو باہر نہیں کھلتے
کب اندر کھلتے ہیں
آدمی جب کچھ بولے
تب جوہر کھلتے ہیں
لوگ اکثر نہیں کھلتے
ہم اکثر کھلتے ہیں
دست و پا کیا کھلتے
خیر و شر کھلتے ہیں
تازہ کرنے کو ماحول
دیدۂ تر کھلتے ہیں
یادؔ اکثر ہم خود پر
بارِ دگر کھلتے ہیں

سید مشکور حسین یاد/لاہور

پیارے خالد احمد کے نام

پڑھا جو ہم نے وہ لکھا ہے خالد احمد کا
کتاب اور یہ کتبہ ہے خالد احمد کا
سخن کے درد میں جذبہ ہے خالد احمد کا
قلم دوات پہ سایہ ہے خالد احمد کا
عروجِ حرف وحکایت میں اسم رکھتا ہے
یہی مقام ہے رتبہ ہے خالد احمد کا
ہماری آنکھ میں باران کے قرینے سے
پیام پیار کا آتا ہے خالد احمد کا
رموزِ شعر کی منزل پہ ہم کہاں ٹھہریں
کہ اس کے آگے تو رستہ ہے خالد احمد کا
سکوتِ مرگ میں اشعار حرف فرما ہیں
ورق پہ نام تو زندہ ہے خالد احمد کا
وفا کے طور جو ثاقبؔ دکھائی دیتے ہیں
خلوص دیکھنے والا ہے خالد احمد کا

آصف ثاقب/ایبٹ آباد

چال

چال تمہاری دیکھن جوگ
آنکھوں میں ہے پیتم جوت
عشق میں ہلچل ڈالو تم
ہم کو دیکھو بھالو تم
بات سمجھ میں آتی ہے
حسن تمہارا ذاتی ہے
باتوں میں ہے میٹھا رس
تم پر آیا رنگنا برس
پتھر پاؤں میں نرم ہوا
سینہ اس کا گرم ہوا
اتنا بتاؤ میری جان
تم کو ہوا ہے کس کا مان
ہونٹوں پر ہیں کس کے گیت
کون تمہارا ساجن میت
لوگ نہ سمجھیں گہری چال
پوچھے کون تمہارا حال
جانے ایسی ویسی ہو
راج کماری کیسی ہو

آصف ثاقب/ایبٹ آباد

محبت پر یہ آوازے دُکھوں کے
کہ داسی پانو چھوتی ہے بتوں کے
تمہارے بیگ میں بھر دوں کہو تو
یہ بادل سانس لیتے پربتوں کے
بہت ہیں وسعتِ میداں کے دھوکے
کہ لشکر کھینچتا ہوں وحشتوں کے
حویلی میں ترے لب کا ستارا
مقدر میں کہاں ہے راستوں کے
ترا ہنس ہنس کے شیشے توڑ دینا
ترا پہلو میں رونا موسموں کے
میں یہ آنکھیں گنوا کے سیرِ دُنیا
اُجال آیا ہوں موتی حیرتوں کے
سن اے آوازِ کُن ساحری سن
اُلٹ یہ طشت گیلے ساحلوں کے
وہ میرے حال پہ روتی ہے عامرؔ
تو کیا ہوتے ہیں آنسو پتھروں کے
وہ سبزے پر ابھی لیٹے گی عامرؔ
کوئی پٹ کھول دے گا بارشوں کے
میں لکھتا ہوں وہ باتوں جن کو عامرؔ
بھلا بیٹھے ہیں سینے شاعروں کے

عامر سہیل/بہاولنگر

جھولے ساون کے، وہ بارش وہ گھٹائیں یاد ہیں
کو کو کوئل کی، پپیہے کی صدائیں یاد ہیں
دھڑکنوں میں جذب چاہت کی ادائیں یاد ہیں
بے وفائی کے جلو میں کچھ وفائیں یاد ہیں
چاندنی راتیں، ہوا مہکی ہوئی، گہرا سکوت
چھپ کے ملتے تھے جہاں ہم وہ گپھائیں یاد ہیں
بن کہے جو کہہ گئے تم یاد ہے اب بھی ہمیں
پوچھ کر ہم سے جو کی تھیں سب خطائیں یاد ہیں
یاد آتے ہیں ابھی تک وہ انا کے مرحلے
مل کے پھر دونوں نے مانگیں جو دُعائیں یاد ہیں
تم سے دوری کا وہ غم، اس پر زمانے کے ستم
وقت نے جو ہم پہ کیں ساری جفائیں یاد ہیں
اک تمنا کی تھی دل نے ساتھ تم میرے رہو
اس تمنا کی جو پائی تھیں سزائیں یاد ہیں

تسنیم کوثر/لاہور

ہمیں تم سے نہیں ملنا
نہیں کرنا گلہ کوئی
نہیں فریاد اب کرنا
نہیں کچھ یاد اب کرنا
کسی بھی ریشمی لمحے کی یادوں سے
نہیں پلکوں کو نم کرنا
لپٹ کر ٹوٹے وعدوں سے
نہیں اب کوئی غم کرنا
حسیں خوابوں کی بکھری کرچیوں
کو بھی نہیں چننا
جو قسمیں توڑ دیں تم نے
سبب ان کا نہیں سننا
حسیں سرگوشیوں سے رنگ
جیون میں نہیں بھرنا
کوئی وعدہ نہیں لینا
کوئی وعدہ نہیں کرنا

تسنیم کوثر/لاہور

اپنے احباب سے کچھ روز جدا رہتا ہوں
یعنی کچھ روز مسائل سے بچا رہتا ہوں
گھر کی دیوار پرندوں سے بھری رہتی ہے
ناتواں جسم لیے میں بھی پڑا رہتا ہوں
دھڑکنیں آپ ہی ترتیب میں آ جاتی ہیں
میں تو بس اشک لیے محو دعا رہتا ہوں
تجھ سے ناراض تو ہو جاتا ہوں لمحہ بھر میں
پھر بہت دیر میں خود سے بھی خفا رہتا ہوں
سانس جب تازہ ہواؤں کو طلب کرتی ہے
در و دیوار سے کچھ دور پڑا رہتا ہوں
وہ سمجھتا ہے مجھے راہ کی دیوار میاں
بس اسی واسطے منظر سے ہٹا رہتا ہوں
ایسا ہوتا ہے کہ سوچوں میں ترا عکس لیے
ہاتھ باندھے ہوئے چپ چاپ کھڑا رہتا ہوں
میرا اس شہر میں کوئی بھی نہیں ہے عامرؔ
میں تو اس شہر میں بس نامِ خدا رہتا ہوں

مقصود عامر/لاہور

کارِ درویش کو آسان بنا دیتا ہوں
ایک درویش ہوں اور دل سے دُعا دیتا ہوں
وہ مجھے خواب کی تفصیل بتاتا بھی نہیں
اور میں خواب کی تعبیر بتا دیتا ہوں
اس لیے راستے آسان ہوئے ہیں مجھ پر
پاؤں تھک جائیں تو رفتار بڑھا دیتا ہوں
پہلے لکھتا ہوں میں کاغذ پہ مسائل اپنے
اور پھر صبر کے دریا میں بہا دیتا ہوں
یاد تم بھی نہ کوئی بات پرانی رکھو!
جو مرے ساتھ ہوا میں بھی بھلا دیتا ہوں
لمحہ وصل مری سمت چلا آتا ہے
جب میں دہلیز کو دیوار بنا دیتا ہوں
بس یہی بھول کہ ہو جاتی ہے اکثر مجھ سے
تیری آواز میں آواز ملا دیتا ہوں
جب کوئی پوچھنے آتا ہے ترے بارے میں
اتنا سادہ ہوں کہ ہر بات بتا دیتا ہوں

مقصود عامر/لاہور

کارِ دشوار جو دشوار ہے بس
کچھ سہولت ہمیں درکار ہے بس
آپ سے دل کو میرے پیار ہے بس
اور میری آنکھوں میں اظہار ہے بس
معتبر ہو نہیں سکتے کبھی ہم
ہم کو حق گوئی کا آزار ہے بس
کوئی بھی اب تو مری سمت نہیں
جو ہے غالبؔ کا طرفدار ہے بس
میرے ہونٹوں پہ ہے اقرار وفا
اور ترے ہونٹوں پہ انکار ہے بس
ہے کوئی میرے علاوہ بھی ندیمؔ
ہاں یہ بندہ ہی گنہ گار ہے بس

ریاض ندیم نیازی/سبی

ہمیں تم سے شکایت ہے، بہت ہے
چلو تم کو ندامت ہے، بہت ہے
خلش میں دل کی شدت ہے، بہت ہے
سمجھ لو یہ محبت ہے، بہت ہے
ترے ہونٹوں کا ہلکا سا تبسم
یہی بس اپنی قیمت ہے، بہت ہے
نہیں ہے اب دیانت نام کو بھی
ہر اک دل میں خیانت ہے، بہت ہے
ندیمؔ اس کے علاوہ کیا کہوں میں
مجھے اس کی ضرورت ہے، بہت ہے

ریاض ندیم نیازی/ سبی

خیالِ بت گری ٹھہرا ہوا ہے
طریق آذری ٹھہرا ہوا ہے
فقط تو ہی نہیں رُوٹھا ہے مجھ سے
نظامِ زندگی ٹھہرا ہوا ہے
صنم مت جا کہ اب دل میں ہمارے
کمالِ بندگی ٹھہرا ہوا ہے
تجھے سنگھار سے کیا، تو تو دل میں
بوجہ سادگی ٹھہرا ہوا ہے
تیرا سائلؔ فقط جانِ تمنا
بوجہ بے بسی ٹھہرا ہوا ہے

سائل رضا/ بھلوال

وہ زمیں پھر سے......

وہ زمیں پھر سے
کیوں پکارتی ہے مجھے
جہاں مٹی کے کچے گھر
سورج کے ساتھ سرخ
اور بادلوں کے ساتھ سانولے ہو جاتے تھے
جہاں قہوے کے مہکتے باغوں میں
ایک ایک دل کش سبز پتی
میری ہنسی، تمہاری بے خودی سے آشنا تھی
جہاں چارکول سے رنگے بدن
چراگاہوں میں مویشی چراتے ہوئے
شوخ لباسوں میں اپنا عکس چھپا لیتے تھے
اور سنسان سڑک کنارے
میرا بے جا خوف، تمہارا جنوں
مسائیوں کے نغموں میں ہم آواز ہو جاتے تھے
جہاں قطرہ قطرہ پگھلے سورج میں ڈوبیں
نیلی جھیلیں دیوانی ہو کر
نارنگی اوڑھنی میں شام ڈھلے مسکراتی تھی
جہاں ندی سے پانی پیتے شیروں کو دیکھ کر
اندھیری راتوں میں میرا ہاتھ تھام کر تم
میری دھڑکنیں جگنوؤں کی آنکھوں میں گن لیتے تھے
آج سانسیں پھر سے اُلجھی ہیں
بجھے سے چہرے پر چراغ روشن ہوئے ہیں
وہ زمیں پھر سے کیوں پکارتی ہے مجھے......

تن دیپ تمنا/ کینیڈا

ضعیفی میں، نہ بچپن میں، نہ اس عہدِ جوانی میں
نہیں رکھا ہوا کچھ بھی محبت کی کہانی میں
یقیناً آج کوئی راستہ مل جائے گا مجھ کو
کہ اب میں ڈوبنے کے واسطے اترا ہوں پانی میں
زمانے نے مرے اوہام سارے ختم کر ڈالے
نہ ہو جب سر سلامت، خوف کیسا سرگرانی میں
مجھے خاموش رہنے دے وگرنہ جانِ جاں تجھ کو
زمانہ ڈھونڈ لے گا میرے لفظوں کی روانی میں
مجھے لگتا ہے اب یہ آخری دیدار ہے تیرا
کہ اب ہمراہ ہیں دونوں حیاتِ جاودانی میں
نہ ہو وقتی پذیرائی تو سائلؔ اور کیا ہو
یہاں کچھ بھی نہیں اظہار کی شعلہ بیانی میں

سائل رضا/ بھلوال

اک ایک کر کے پرندے چلے گئے چپ چاپ
درخت چھوڑ کے سارے چلے گئے چپ چاپ
ہم ان کا طرزِ تغافل کہیں کہ طرزِ ادا
وہ دھوم دھام سے آئے چلے گئے چپ چاپ
کئی دنوں سے بہت خاموشی ہے گلیوں میں
کہاں پہ گاؤں کے بچے چلے گئے چپ چاپ
وہ بزمِ شعر میں آئے تھے گنگناتے ہوئے
مگر بیاض اُٹھائے چلے گئے چپ چاپ
نہ جانے کتنے ہی احباب دارِ فانی سے
وفا کے دیپ جلائے چلے گئے چپ چاپ
کسی بھی شخص پہ افشائے راز ہو نہ سکا
وہ دل کا کرب چھپائے چلے گئے چپ چاپ
نہیں تھا آپ کو دانش سے اختلاف کوئی
تو کیوں بغیر بتائے چلے گئے چپ چاپ

اعجاز دانش/ میلسی

ظفر اقبال/لاہور

تصویر کے تقاضے سب کر دیے ہیں پورے　　پانی سے دور ہٹ کر پایا الگ بنایا

ظفر اقبال کو میں نے اُس وقت پہچانا جب میری نظر میں ناصر کاظمی کی غزل اور منیر نیازی کی نظم کے سوا دورِ حاضر کے کسی شاعر کا کلام جچتا ہی نہ تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ ظفر اقبال ایک ایسا شاعر ہے جس کی بات بھی نئی ہے، لہجہ بھی نیا ہے اور زبان بھی نئی ہے۔ ناصر اور منیر نے اُردو شاعری کو نئی بات بھی دی ہے اور نیا لہجہ بھی لیکن انھوں نے زبان کے تقدس کا بہت خیال رکھا ہے۔ یہی کچھ ان کے ایک بڑے پیش رو فیض احمد فیض نے کیا تھا۔ اُس نے بھی نئی بات نئے لہجے میں کی تھی لیکن زبان وہی استعمال کی تھی جو میر، مصحفی، غالب اور اقبال تک آتے آتے کوثر و تسنیم میں ڈھل چکی تھی۔ ایک اور بات جو مجھے متاثر کرتی ہے ظفر اقبال کا یہ رویہ ہے کہ وہ نہ صرف پرانوں میں نیا نظر آتا ہے بلکہ تازہ ترین شاعروں سے بھی تازہ تر دکھائی دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر دور کے بڑے شاعر اور فن کار کی طرح وہ اپنے اردگرد کے تمام درمیانے درجے کے شاعروں اور فن کاروں کے کلام سے استفادہ کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا ہے۔ جس کے پاس جو مال ہوتا ہے وہ سب سے لے کر اپنی بھٹی میں ڈال کر اپنا "عیب و ہنر" بنا لیتا ہے۔ بڑے فقیر بھی یہی کرتے ہیں۔ اُن کی دیگ میں ہر کسی کا لایا ہوا دال دلیا پک کر تبرک بن جاتا ہے۔ ظفر اقبال کی شاعری دورِ حاضر کی رنگا رنگ واردات کا بڑا لذیذ اور مفرح تبرک ہے۔

شاد کیسا ہو گیا، آباد کیسا ہو گیا
دور رہ کر مجھ سے وہ آزاد کیسا ہو گیا
میں کہ جو اِک عمر سے پروا نہ رکھتا تھا بہت
وہ ہی دن میں مائلِ فریاد کیسا ہو گیا
اُس کے جانے سے اثر پڑتا تھا پہلے بھی بہت
شہر، لیکن، اس دفعہ برباد کیسا ہو گیا
مدتوں کے بعد مل کر خوش نہ تھا اتنا بھی وہ
میں بھی اُس کو دیکھ کر ناشاد کیسا ہو گیا
اس کی ترکیبِ تغافل معتبر تھی کس قدر
اور اپنا عشق بے بنیاد کیسا ہو گیا
کیا بدل کر رکھ دیا اظہارِ اُلفت نے اُسے
پہلے وہ کیسا تھا اُس کے بعد کیسا ہو گیا
میں نے اس کو دل میں دہرایا ہی تھا دو ایک بار
اور وہ سارے کا سارا یاد کیسا ہو گیا
میں نے مارے تو بہت شعر و ادب میں ہاتھ پاؤں
کچھ نہ بن پایا تو پھر نقاد کیسا ہو گیا
دیکھ لو، تھوڑی سی کوشش سے ہمارا بھی ظفرؔ
نام اُس فہرست میں ایزاد کیسا ہو گیا

منزل الگ تراشی، رستہ الگ بنایا
پھر ڈوبنے کو ہم نے دریا الگ بنایا
تسخیر جس جہاں کی مطلوب تھی، سو پہلے
خود ہم نے اس جہاں کا نقشہ الگ بنایا
کھیتی الگ اُگائی آنکھوں کی سرزمیں سے
اور دل کے آسماں پر تارا الگ بنایا
بھولے نہ اصل اپنی اس کیمیا گری میں
مٹی جدا بچھائی، سونا الگ بنایا
تصویر کے تقاضے سب کر دیے ہیں پورے
پانی سے دُور ہٹ کر پایا الگ بنایا
تنہائی چھا گئی تو محفل سجائی اپنی
وحشت ہوئی تو ہم نے صحرا الگ بنایا
خانوں میں کر دیا جب تقسیم دل کو ہم نے
اس کا الگ بنایا، اپنا الگ بنایا
مشترکہ بھی بنائے تعمیر کے عجوبے
ویسا نہ بن سکا پھر جیسا الگ بنایا
جیسے تھے خود ظفرؔ وہ ویسے ہی بن گئے ہم
عزت بہت کمائی، پیسا الگ بنایا

گزرنا پڑا سرسراتے ہوئے
نیا کوئی نقشہ جماتے ہوئے
کسی اور تصویر کے شوق میں
کوئی اور منظر دکھاتے ہوئے
کسی اور الزام کی دُھن میں ہوں
کوئی اور تہمت اُٹھاتے ہوئے
یہاں سے نکل جاؤں گا ایک دن
کہیں اور ڈھومیں مچاتے ہوئے
فضا میں بکھر جاؤں گا ٹوٹ کر
کہیں دور سے جھلملاتے ہوئے
اب اتنا بھی خود پر بھروسا نہیں
جو رونے ہی لگ جاؤں گاتے ہوئے
مجھے بھی ذرا پوچھ لیتا ہے وہ
بس آتے ہوئے اور جاتے ہوئے
ندامت کے ساحل پہ اُتریں گے ہم
محبت کے چھینٹے اُڑاتے ہوئے
خوش اخلاق تھا، اُس نے انکار بھی
کیا ہے ظفرؔ مسکراتے ہوئے

مدت سے کوئی میرے بھی جیسا نہیں آیا
میں یونہی تو منظر پہ دوبارہ نہیں آیا
باقی ابھی کتنا ہے بدی کا یہ سمندر
ہوں کب سے رواں اور کنارہ نہیں آیا
موسم کئی گزرے ہیں کہ اس پردۂ دل پر
بازو نہیں لہرائے ہیں، چہرہ نہیں آیا
نکلے تھے یہ کس اندھیرے کے سفر پر
آنکھیں تو پلٹ آئیں، تماشا نہیں آیا
لوگوں میں ظفرؔ آپ زباں ساز بھی کہلائے
اور، بات بھی کرنے کا سلیقہ نہیں آیا

عطاء الحق قاسمی/لاہور

مسجد سے ہو رہی ہے عطا فجر کی اذاں
اب تو مرے نگر میں سحر ہونی چاہیے

عطاء الحق قاسمی ایک جرأت مند لکھاری ہے۔ وہ مزاج کا کھرا اور کردار کا بہادر ہے۔ عطاء کا یہی وصف اس کی خوبیوں پر بھاری ہے اور اسی سبب سے وہ مجھے پسند ہی نہیں میری نظر میں محترم بھی ہے۔ عطاء کی شگفتہ نثر کا ایک عالم گرویدہ ہے۔ ایسے عاشقانِ عطا کو مژدہ ہو کہ جس شخص کی نثر نے پڑھنے والوں کے من موہ لیے ہیں اب اس کے شعری مجموعہ کا تازہ ایڈیشن نئی تخلیقات کے ساتھ شائع ہو گیا ہے۔ مزاح کی چاشنی اپنی جگہ مگر عطا کی شاعری میں خصوصیت سے غزل میں اس کے اصل خدوخال اُبھرتے ہیں کوئی کوئی شعر تو اس کرب کو نمایاں کر دیتا ہے جو اس کی تحریروں کا مخفی خزانہ ہے۔ ایک دکھ کی لہر Under Current کے طور پر اس کے سازِ سخن میں ہلکورے لیتی محسوس ہوتی ہے۔ ایسا کیوں ہے میری سمجھ میں نہیں آتا مگر ایسا ہے اور میرا یہ گمان نہیں بلکہ ایمان ہے کہ قہقہے بانٹنے والے لوگوں کے خلوت کدوں میں دُکھ کے آتشدان بھڑکتے رہتے ہیں جن کی چنگاریاں سننے اور پڑھنے والوں کے دامنِ دل تک جا پہنچتی ہیں۔ (احمد فراز)

کہیں گلاب میں ہوں اور کہیں ببول میں ہوں
کسی کی یاد میں ہوں اور کسی کی بھول میں ہوں
مری تلاش میں نکلیں نہ قافلے والے
دکھائی دوں گا، ابھی راستے کی دھول میں ہوں
بندھا ہوا ہے مرا دل حفیظ تائب سے
پڑا ہوا میں درِ عاشقِ رسولؐ میں ہوں
میں وہ دعا ہوں عطا جو ہر ایک لب پہ ہے
بس اتنا ہے کہ ابھی عرصۂ قبول میں ہوں

کسی کی سوچ کو جب راستہ نہیں ملتا
تو پھر زمیں سے فلک تک خدا نہیں ملتا
تمہارے حسن میں وہ روشنی نہیں موجود
ہمارے عشق میں وہ رت جگا نہیں ملتا
ہمیں نے روک رکھے ہیں یہاں سبھی رستے
ہمیں کو ہے یہ گلہ راستہ نہیں ملتا
وہاں سے لوٹ کے آئے کوئی تو بتلائے
وہاں پہ کیا ہمیں ملتا ہے، کیا نہیں ملتا؟
ہجوم اتنا جوابوں کا ہو گیا ہے عطا
کسی سوال کو اب راستہ نہیں ملتا

خوشبوؤں کا اک نگر آباد ہونا چاہیے
اس نظامِ زر کو اب برباد ہونا چاہیے

ان اندھیروں میں بھی منزل تک پہنچ سکتے ہیں ہم
جگنوؤں کو راستہ تو یاد ہونا چاہیے
جس کی زد میں ہوں ستم گر کے سبھی تیر و کماں
کوئی ایسا بھی ستم ایجاد ہونا چاہیے
خواہشوں کو خوبصورت شکل دینے کے لیے
خواہشوں کی قید سے آزاد ہونا چاہیے
ظلم بچے جن رہا ہے کوچہ و بازار میں
عدل کو بھی صاحبِ اولاد ہونا چاہیے
عرض کرتے عمر گزری ہے عطا صاحب جہاں
آج اس محفل میں کچھ ارشاد ہونا چاہیے

تھوڑی سی اس طرف بھی نظر ہونی چاہیے
یہ زندگی تو مجھ سے بسر ہونی چاہیے
آئے ہیں لوگ رات کی دہلیز پھاند کر
ان کے لیے نوید سحر ہونی چاہیے
اس درجہ پارسائی سے گھٹنے لگا ہے دم
میں ہوں بشر، خطائے بشر ہونی چاہیے
وہ جانتا نہیں تو بتانا فضول ہے
اُس کو مرے غموں کی خبر ہونی چاہیے
مسجد سے ہو رہی ہے عطا فجر کی اذاں
اب تو مرے نگر میں سحر ہونی چاہیے

وہ ستارا جو آسمان میں تھا
ایک دن میرے بادبان میں تھا
اک جزیرہ تھا میرے خوابوں کا
اک سمندر بھی درمیان میں تھا
میں تو تھا قریۂ جمال میں گم
وہ کسی اور ہی گمان میں تھا
جسم پھولوں بھری کیاری تھی
اور کانٹا کوئی زبان میں تھا
تیر آیا تھا کس طرف سے عطا
میں تو بیٹھا ہوا مچان میں تھا

آخری رابطہ بھی یاد نہ تھا
وہ ملا تو گلہ بھی یاد نہ تھا
رات اُتری ہوئی تھی صحرا میں
اور ہمیں راستہ بھی یاد نہ تھا
ہر کوئی تھا بتوں سے بھی نالاں
اور کسی کو خدا بھی یاد نہ تھا
جو مجھے گھر سے ڈھونڈنے نکلے
ان کو میرا پتہ بھی یاد نہ تھا
وہ بھلا عرضِ حال کیا کرتے
جن کو اپنا کہا بھی یاد نہ تھا

خود اپنی ذات کو بے وزن کر گئے ہم بھی
خلا ملا تو خلا میں اُتر گئے ہم بھی
وہ چاندنی، وہ سمندر، وہ رُخ بدلتی ہوا
وہ شور تھا کہ تلاطم سے ڈر گئے ہم بھی
تو ایک موجہ گل تھا، یہ تیرا رستہ تھا
بس ایک رو میں ادھر سے گزر گئے ہم بھی
عجب نہ تھا کہ یہ افلاک گرد ہو جاتے
ٹھٹکتا دیکھ کے تجھ کو ٹھہر گئے ہم بھی
خدا کی شان کہ مقتل کو دھج ملی ہم سے
خدا کا شکر کہ اک روز گھر گئے ہم بھی
ترے کمال کا اک رنگ ہم بھی تھے لیکن
ترے کمال کی ہیبت سے ڈر گئے ہم بھی
یہ زندگی فقط اظہار کا تماشا تھی
ادا، حیات کا تاوان کر گئے ہم بھی
دمک اُٹھے ابھی رستے لہو کی لو سے نجیب
چراغ شب کی ہتھیلی پہ دھر گئے ہم بھی

کیوں چشم تن چرا نہ سکا، کچھ خبر نہیں
وہ رات کس ترنگ میں تھا، کچھ خبر نہیں
اک خار ہجر ہی خس و خاشاک تن میں تھا
کیونکر یہ زہر پھیل گیا، کچھ خبر نہیں
دل کے ورق پہ سطر بگولوں کے حرف تھے
یہ دشت کب کتاب ہوا، کچھ خبر نہیں
ہر کج کلاہ خاک در یار ہو گیا
کیا حال اہل غم کا ہوا، کچھ خبر نہیں
بیٹھے رہے زمین پہ گھٹنوں میں سر دیے
ہم پر کب آسمان گرا، کچھ خبر نہیں
وہ کنج لب میں گوش بر آواز تھا، مگر
کیا ان کہا بھی اُس نے سنا، کچھ خبر نہیں
اک بات لب پہ آئی تھی بے ساختہ ادھر
چہرہ وہ کیوں گلاب ہوا، کچھ خبر نہیں
کیوں گھر کی سمت پھیر لیا ہم نے رُخ نجیب
کب کس نے ہاتھ کھینچ لیا، کچھ خبر نہیں

بھنور آنکھوں میں پیدا ہو رہا ہے
کہ دل میں حشر برپا ہو رہا ہے
بشر بے موت مارے جا رہے ہیں
مسیحائی کا چرچا ہو رہا ہے
ہم ایسے بھی گئے گزرے نہیں ہیں
ہمارے ساتھ یہ کیا ہو رہا ہے
بنام عدل خنجر کے جلو میں
محافظ تخت آرا ہو رہا ہے
ورق تاریخ کے چلا رہے ہیں
ہوا تھا جو دوبارہ ہو رہا ہے
ہوا کے ہاتھ خوشبو سے تہی ہیں
کہیں پامال سبزہ ہو رہا ہے
برا ہونا نہیں وجہ ستائش
مگر اس پر بھی جھگڑا ہو رہا ہے
نجیب اک دن جو پاؤں پڑ رہا تھا
وہ پانی سر سے اُونچا ہو رہا ہے

سر الواح یادگار نہ تھے
کم نمو تھے سو آشکار نہ تھے
سانس تک حسب آرزو نہ لیا
اہل غم، اہل اختیار نہ تھے
خاک ہی کچھ نمو گرفتہ تھی
پھول پروردۂ بہار نہ تھے
کتنے محفوظ تھے گلی کوچے
جب فصیلوں پہ چوب دار نہ تھے
موج طوفاں پہ کف تھی لیکن ہم
کاغذی ناؤ پر سوار نہ تھے
سنسنی سی سفر میں رہتی تھی
ہم تو رستوں کے زیر بار نہ تھے
راہ مانگی نہ مشورہ مانگا
غرقِ غم، غرقِ انتشار نہ تھے

باقی احمد پوری/لاہور

وہی ناوک، نشانے جوں کے توں ہیں
ستمگر کے بہانے جوں کے توں ہیں
کوئی اک حرف بھی بدلا نہیں ہے
محبت کے فسانے جوں کے توں ہیں
خزاں آنے سے پہلے لوٹ آؤ
ابھی موسم سہانے جوں کے توں ہیں
وہی ہیں غم کی ساری داستانیں
وہی عنوان پرانے جوں کے توں ہیں
چمکتی بجلیاں پھر پوچھتی ہیں
یہاں کچھ آشیانے جوں کے توں ہیں
ابھی تو رزق ملتا ہے زمیں سے
سمندر کے خزانے جوں کے توں ہیں
ابھی تک یاد آتی ہے تمہاری
وہ بچپن کے زمانے جوں کے توں ہیں
دلوں میں حوصلہ باقی ہے اب تک
ترے غم کے ٹھکانے جوں کے توں ہیں

خدا جانے کہاں غائب ہوئی ہے
وفا جانے کہاں غائب ہوئی ہے
عجب اک حبس کا عالم ہے ہر سو
ہوا جانے کہاں غائب ہوئی ہے
بڑھی جاتی ہے ہر دم بے ضمیری!
انا جانے کہاں غائب ہوئی ہے
یہ ریگِ خشک مجھ سے پوچھتی ہے
گھٹا جانے کہاں غائب ہوئی ہے
میں ہاتھوں کو اُٹھائے تھک گیا ہوں
دعا جانے کہاں غائب ہوئی ہے
مسیحا تو بہت بنتے ہیں لیکن
شفا جانے کہاں غائب ہوئی ہے
سبھی کے ہاتھ خوں میں تر ملے ہیں
حنا جانے کہاں غائب ہوئی ہے
جو کوہِ طور پر آئی تھی باقی!
صدا جانے کہاں غائب ہوئی ہے

غرقِ دریائے محبت جو ہوا پار ہوا
بسکہ آسان ہوا کام جو دشوار ہوا
دامِ صد رنگ بچھا رکھے ہیں تو نے جاناں
جو تری راہ سے گزرا وہ گرفتار ہوا
اب اسے تو ہی مٹائے تو مٹائے آ کر
ایک فتنہ جو ترے نام سے بیدار ہوا
دل مرا مصر کا بازار ہے لیکن اس میں
کوئی یوسف نہ کبھی رونق بازار ہوا
ہاتھ جاتا نہیں دامانِ فلک تک میرا
قہر میں اپنا گریباں ہی سدا تار ہوا
اپنی ہستی کو مٹانا بھی نہیں ہے آساں
اپنا ہونا بھی زمانے میں مجھے بار ہوا
بات ہی ایسی کوئی پوچھ رہا تھا باقی
کھل کے اقرار ہوا مجھ سے نہ انکار ہوا

کم نہ اس کھیل میں دریاؤں کا پانی پڑ جائے
آنسوؤں سے نہ کہیں آگ بجھانی پڑ جائے
منزلِ عشق کی جانب تو چلے ہیں پھر سے
کاش رستے میں وہی شام سہانی پڑ جائے
شعر حافظ ہی سے تحریک غزل کی لینا
اس غزل کو جو غزل کوئی سنانی پڑ جائے
شوقِ وسعت ہی کہیں گھر کو نہ برباد کرے
یہ نہ ہو چھت بھی کسی روز گرانی پڑ جائے
ان امیروں کی تو کچھ بات نہیں ہے باقی
ہم غریبوں کی اُمیدوں پہ نہ پانی پڑ جائے

غم سے آزاد ہم کہاں ہوں گے
دُکھ جو دل میں ہیں کم کہاں ہوں گے
مل تو جانے دو بال و پر ہم کو
پھر نہ جانے قدم کہاں ہوں گے
جن کی صحرا میں زندگی گزری
آنسوؤں سے وہ نم کہاں ہوں گے
پتھروں سا مزاج ہے جن کا
ٹوٹ جائیں گے خم کہاں ہوں گے
وقت کی ہے کسے خبر باقی
تم کہاں اور ہم کہاں ہوں گے

اس زمیں پر قدم کیا جمائے کوئی
ریت پیروں کے نیچے ٹھہرتی نہیں
حادثہ ایک ہونے سے بچ بھی گا
نیند آنکھوں میں بھی اُترتی نہیں

فرخ راجا/اسلام آباد

میں تنہائی سے ہوں مانوس لیکن　　تم آئے ہو تو اچھا لگ رہا ہے

فرخ راجا کا نام شعری تخلیق کے حوالے سے کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ شاعری اُن کا خاندانی ورثہ ہے۔ جناب جوہر نظامی کی صحبت کے فیض نے انھیں وہ ساری شاعرانہ جہتیں عطا کی ہیں جن پر انھوں نے اپنے انفرادی لب و لہجے کی چھاپ چڑھا کر وہ، وہ ندرتیں پیدا کی ہیں کہ داد و تحسین کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ وہ زمانہ طالب علمی سے ہی اپنی شعری پہچان بنا چکے تھے۔ اب بھی وہ ایک کہنہ مشق شاعر کی حیثیت سے شاعری کے اُفق پر تاباں ہیں۔ (ارژنگ)

غزل ہے گیت ہے یا کوئی نغمہ میرے اندر
سدا رس گھولتا ہے ایک لہجہ میرے اندر
یہی رنگِ معانی ہے یہی حسن یقیں ہے
سمٹ آیا ہے اک ذرّے میں صحرا میرے اندر
سخن تشنہ ہوں اور دشت محبت میں کھڑا ہوں
رواں ہے آنسوؤں کا گرچہ دریا میرے اندر
کسی کا مسکرانا بھی بڑھاتا ہے مرا درد
نہ جانے کس قدر ہے زخم گہرا میرے اندر
ہر اک غم کو ملے آ کر یہاں تسکین گویا
زمانے بھر کے دُکھ ایسے ہیں یکجا میرے اندر
محبت سارے انسانوں سے خوشیاں سب کی خاطر
یہ جذبہ کس نے رکھ چھوڑا ہے تنہا میرے اندر
وہ ملتا ہے تو مجھ کو اجنبی لگتا ہے فرخ
نہ جانے مختلف کیوں ہے وہ چہرا میرے اندر

گماں نشاط ہے یا کیف بدگمانی ہے
جہانِ فکر میں لفظوں کی حکمرانی ہے
کسی بدن سے نہ ظاہر ہوں گر صفات اُس کی
وجودِ ذات اگر ہے تو اک کہانی ہے
یہ سوزِ دل ہے جو پگھلا رہا ہے میرا بدن
اسی لیے مری آنکھوں میں گرم پانی ہے
میں ایک کھڑکی کھلی رکھ کے رات سوتا ہوں
یہ میرے گھر کی روایت بڑی پرانی ہے
میں ہوں خیال کی شائستگی سے شرمندہ
زمانے بھر کو اگر ذوقِ بدزبانی ہے
دکھایا میرے سفر نے مجھے اک ایسا محل
جہاں پہ راجا ہوں اور ساتھ میرے رانی ہے

ناکام سہی پھر بھی اصولوں پہ لڑے ہیں
ہم وہ تو نہیں ہیں جو فقط ضد پہ اڑے ہیں
پامال کیا جبر نے ناموسِ قلم کو
تاریخ نے لگتا ہے کچھ افسانے گھڑے ہیں
ہوں عہدِ خزاں میں کبھی دیکھوں جو پلٹ کر
بکھرے ہوئے پتوں کی طرح خواب پڑے ہیں
آدابِ محبت کو فراموش کیا ہے
میں اُن کا گنہگار ہوں جو مجھ سے بڑے ہیں
کچھ شوق سفر ہے نہ ہدف ہے نہ تعلق
ہم لوگ کس اُمید پہ صحرا میں کھڑے ہیں
فرخ تجھے تہذیبِ سخن کس نے سکھائی
موتی ہیں کہ الفاظ کے تاروں میں جڑے ہیں

دلِ آئینہ جو اُجلا لگ رہا ہے
مجھے ہر شخص خود سا لگ رہا ہے
سجے ہیں جس کی آنکھوں میں کئی خواب
وہ دنیا بھر کو تنہا لگ رہا ہے
اذیت ہے مرا اُس گھر سے جانا
جہاں ہر فرد اپنا لگ رہا ہے
ہوائیں تیز، کرتے ہیں شجر رقص
نئے موسم کا میلہ لگ رہا ہے
ہے جانے کون خرم راز اُس کا
سمندر مجھ کو پیاسا لگ رہا ہے
میں تنہائی سے ہوں مانوس لیکن
تم آئے ہو تو اچھا لگ رہا ہے
اُسی سے روشنی تھی زندگی میں
وہ آئینہ جو دُھندلا لگ رہا ہے
میں ان سے دور بیٹھا ہوں بہت دُور
نہ جانے اب وہ کیسا لگ رہا ہے
ہر اک سے مل رہا ہے ہنس کے فرخ
مگر کچھ دل گرفتہ لگ رہا ہے

میں خوش نظر آتا ہوں پر آنکھیں مری نم ہیں
وہ مجھ کو سمجھتے ہیں جو آسودۂ غم ہیں
کتنے ہی مرے جرم چھپائے ہیں کسی نے
جو مجھ پہ لگائے گئے الزام وہ کم ہیں
اے ہمسفرو! پاؤ گے شادابیِ منزل
ویرانوں میں کھلتے ہوئے کچھ نقش قدم ہیں
رازِ غم ہستی کو چھپانا ہے ضروری
ہر دل کے ورق پر یہی الفاظ رقم ہیں
فرخ مجھے کیوں لگتا ہے میں ہار گیا ہوں!
جب فتح محبت کے سب اسباب بہم ہیں

ارشد نعیم /شیخوپورہ

یہ گفتگو ہے کسی اور ہی زمانے سے
مرا خطاب ترے عہدِ رائیگاں سے نہیں

شیخوپورہ میں مقیم معروف شاعر ارشد نعیم نظم اور غزل دونوں اصنافِ سخن میں یکساں مہارت اور اعتبار رکھنے والے معدودے چند شعراء میں سے ایک ہیں۔ ہجر، انتظار اور نارسائی کے احساسات ان کے شعری اسلوب کی اساس ہیں۔ ان کی نظموں اور غزلوں میں خیال کی لے اور اسلوب کی وحدت کا تاثر فیض اور منیر نیازی جیسے شعراء کی یاد دلاتا ہے۔

ارشد نعیم کی نظمیں اپنی نامیاتی وحدت اور بھرپور تخلیقی تجربے کے باعث ایک ایسا نقش چھوڑ جاتی ہیں جو قاری کو تادیر اپنے ہونے کا احساس دلاتا رہتا ہے۔ یہ نظمیں جدید نظم کی عمومی روایت سے ہٹ کر غیر ضروری پھیلاؤ کی حامل نہیں ہیں بلکہ مختصر الفاظ میں کوئی گہرا تاثر تخلیقی عمل کا حصہ بنتا ہے۔ سنجیدہ ادبی حلقوں میں ارشد نعیم کا نام اعتبار کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ (پروفیسر عبدالکریم خالد)

رات اور یاد کا منظر

رات بہت ہوا چلی
پتے لرز لرز گئے
شاخیں چٹک چٹک گئیں
میں بھی تھا شاخِ زرد پر
میں بھی لرز لرز گیا
ایک خیالِ بے نمو
دل کے کسی مقام سے
تجھ کو پکارتا رہا
یادوں کے اس غبار کو
اشکوں میں ڈھالتا رہا
رات بہت ہی سرد تھی
دل میں بھی اضطراب تھا
رات بہت ہوا چلی

کسی معدوم لمحے میں

کسی معلوم ساعت میں
کسی موجود منظر میں
مرا ہونا بھی دھوکا ہے......!
کہ میں نے تو کسی معدوم دل میں آنکھ کھولی تھی
کسی بے کار لمحے نے میرا پیکر تراشا تھا
خدائے نارسائی نے پھر اپنی
روح پھونکی تھی
سو اس معدوم ساعت میں
مرا ہونا غنیمت ہے
کہ میں ہونے کی منزل
گردِ رہ میں چھوڑ آیا ہوں
سو میری جاں
تمہارا واہمہ ہوگا
تمہاری آنکھ کے چشمے میں میرا
عکس کیسے جاگ سکتا ہے......؟

میں ستارۂ شبِ وصل تھا

وہی بے اماں سی مسافتیں
وہی بے چراغ سے راستے
مرے چار سو ہی فاصلوں کی کمند ہے
وہی بے بسی کا غبار ہے
انھیں منزلوں کے غبار میں
کوئی پوچھتا ہے میں کون ہوں
اُسے کیا خبر ہے میں کون تھا!
اُسے کیا خبر یہ مسافتیں
کسی حرفِ خواب کے سلسلے کی دلیل ہیں
مرے آنسوؤں سے لکھے ہوئے
یہ جو حرف ہیں
مرے آنسوؤں سے مٹے ہوئے
یہ جو خواب ہیں
کسی دشتِ ہجر کے سلسلے کی
کڑی نہیں
یہ کسی وصال کی ناتمامی کا عکس ہیں
مجھے دیکھ لو
ذرا غور سے مجھے دیکھ لو
کہ میں طاقِ ہجر کا ٹمٹماتا دیا نہیں
میں ستارۂ شبِ وصل ہوں
جسے انتظار کی ساعتوں نے بدل دیا

میں اپنی ہی خاک پر کھڑا ہوں

میں رات کے درد کا صلہ تھا
میں صبح کے خواب کا گلہ ہوں
میں اپنے ہی رنگ میں کھلا تھا
میں اپنے ہی رنگ میں جھڑا ہوں
میں اپنی ہی خاک پر کھڑا تھا
میں اپنی ہی راکھ پر پڑا ہوں

واپسی

ابھی کچھ دیر پہلے تک
یہ منظر ادھ کھلی کھڑکی کی صورت تھا
کہ جس سے روشنی چھن چھن کے آتی ہے
کوئی بھولا ہوا جھونکا
مری آنکھوں کی سیلن میں ذرا سا رنگ بھرتا تھا
ذرا سی دیر کو رکتا تھا اور پھر لوٹ جاتا تھا
ابھی کچھ دیر پہلے ہی
کئی یادیں کتابوں میں پڑے
سوکھے ہوئے پھولوں کی صورت چرمرائی تھیں
مرے دل کے خرابے میں پڑی
یہ نیم پژمردہ سی کلیاں مسکرائی تھیں
ابھی کچھ دیر پہلے تیری یادیں لوٹ آئی تھیں

ڈاکٹر ضیاء الحسن/لاہور

وہ حال ہے اس دل کا کہ کچھ کھلتا نہیں ہے
میں آگ زیادہ ہوں کہ ہوں پانی زیادہ

کوئی نغمہ نیا مجھ کو سُناتے ہیں پرندے
مرے دل کے شجر پر چہچہاتے ہیں پرندے
مجھے سونے نہیں دیتے یہ اپنی شوخیوں سے
سحر دم جاگتے ہیں اور جگاتے ہیں پرندے
پگھلتی جا رہی ہے برف میرے دل کی آخر
سو اب میرے جزیرے پر بھی آتے ہیں پرندے
نہ جانے کون سے قریوں سے آتے ہیں یہ اُڑ کر
نہ جانے کون سے قریوں کو جاتے ہیں پرندے
کِسی اَنجان منزل کے ہیں یہ خود بھی مُسافر
کِسی انجان رستے پر بُلاتے ہیں پرندے
نہ اب اٹکھیلیاں کرتے ہیں میرے شانچوں میں
نہ اب قصّہ کوئی مجھ کو سُناتے ہیں پرندے
نہ اب کرتے ہیں باتیں دُور کی شہزادیوں کی
نہ اب شوقِ سفر دل میں جگاتے ہیں پرندے
نہ اب پرواز کرتے ہیں فضا کی وُسعتوں میں
نہ اب چگتے ہیں دانہ اور نہ گاتے ہیں پرندے

جتنی ہو ترے غم میں فراوانی زیادہ
ہوتی ہے مجھے جینے میں آسانی زیادہ
وہ حال ہے اس دل کا کہ کچھ کھلتا نہیں ہے
مَیں آگ زیادہ ہُوں کہ ہُوں پانی زیادہ
مَیں نُور سراسر ہُوں کہ ہُوں خاک سراپا
مَیں فانی زیادہ ہُوں کہ لافانی زیادہ
جتنا نظر آتا ہُوں مَیں کچھ اس سے سوا ہُوں
موجود میں اِک رنگ ہے امکانی زیادہ
بہتر ہے کہ کچھ اور بھی دُشوار کیا جاؤں
مُشکل میں مجھے ہوتی ہے آسانی زیادہ
لازم ہے کہ بدلے گا مرے شہر کا موسم
فی الحال تو یہ رات ہے طوفانی زیادہ
بیٹھا ہُوں تو بیٹھا ہی نہ رہ جاؤں ضیاؔ مَیں
ہے مجھ پہ گراں اپنی گراں جانی زیادہ

کچھ کارگاہِ ہست سے باہر نکل کے دیکھ
اس سارے بندوبست سے باہر نکل کے دیکھ
یہ زندگی کچھ اور نظر آئے گی تجھے
تُو نشۂ الست سے باہر نکل کے دیکھ
تجھ پر بھی کھل سکے تری ہمواریِ وجود
فرقِ بُلند و پست سے باہر نکل کے دیکھ
کچھ تجھ پہ منکشف ہو تری وُسعتِ کمال
ہنگامِ بود و ہست سے باہر نکل کے دیکھ
روشن ہے کِس طرح ترا آئینۂ خیال
ہنگامۂ شکست سے باہر نکل کے دیکھ
باہر نکل کے دیکھ کبھی اپنے آپ سے
ہاں اپنے حالِ مست سے باہر نکل کے دیکھ

گر دل میں مرے درد ہے اور آنکھ میں نم ہے، تُو ہے
تو ہے کہ مرے دل پہ ترا لطف و کرم ہے، تُو ہے
دُنیا میں مرا ہونا نہ ہونا ہے تجھی سے اے جان!
اے جان! مرے دل میں، مجھے تیری قسم ہے، تُو ہے
جب تک کہ ترا حُسن مرے پیشِ نظر ہے، مَیں ہُوں
جب تک مری آنکھوں مَیں تری زُلف کا خم ہے تُو ہے
تُو ہے، مرے شعروں میں بیاں ہوتا رہے گا جب تک
جب تک مرے ہاتھوں میں یہ کاغذ ہے، قلم ہے، تُو ہے
پہلے بھی یہاں تیرے سوا کوئی نہیں تھا، اے دوست!
اور آج کہ دنیا میں نہ دارا ہے، نہ جم ہے، تُو ہے
میرے لیے تو مرکزِ انوارِ خُدا ہے، اے دل!
توحید پرستوں کے لیے جیسے حرم ہے، تُو ہے

مولانا غلام رسول مہر

احوال و آثار

ڈاکٹر محمد آصف اعوان

مولانا غلام رسول مہر ہماری علمی تاریخ کا ایک تابناک باب ہے۔ اس کتاب میں فاضل مصنف نے مولانا کی علمی و ادبی خدمات کا نہایت تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔

اس کتاب میں مولانا کی حیات اور ان کی علمی زندگی کا تحقیقی انداز میں جائزہ لیا گیا ہے۔ آصف اعوان صاحب کا تعلق چونکہ مولانا مہر کے خاندان سے ہے اس لیے اس تحقیقی کام سے ان کی ایک جذباتی وابستگی بھی ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس پہلے اقبال کی نثر اور اکبر الٰہ آبادی پر بھی دادِ تحقیق دے چکے ہیں۔ یہ کتاب نشریات نے شائع کی ہے۔ اس سے پہلے بھی ادارہ ڈاکٹر آصف اعوان کی معروف کتاب معارفِ خطباتِ اقبال شائع کر چکا ہے۔

حمیدہ شاہین / لاہور

اب اس گھر کی کہانی اور ہوگی — یہاں بچے کمانے لگ گئے ہیں

سنبھال اشکِ ضیابار، دل کے داغ اُٹھا
ترے لیے ہیں مقدس یہی چراغ، اُٹھا
نئے پھلوں میں نیا رس اُتارنے کے لیے
کسی پُرانے شجر سے بنائے باغ اُٹھا
مرے سفید پرندوں کو ورغلاتا ہوا
برائے راہنمائی سیاہ زاغ اُٹھا
بدن تو راہگزر ہے یہاں قیام نہیں
سمیٹ دل کے جھمیلے، شرر دماغ اُٹھا
لباسِ ضبط بھگونے میں ہے کمال اُسے
سنبھل کے ہجر کا رِستا ہوا ایاغ اُٹھا
کہاں گئے تری مٹی اُجالنے والے
نقوشِ پائے قضا سے کوئی سراغ اُٹھا
مَیں کس منڈیر پہ رکھتی چراغ کارِ سخن
یہ بارِ نور بدستِ شبِ فراغ اُٹھا

بلا کی حکمت سے اب سیاہی بولتی ہے
ہماری چپ سے شہہ پا کر تباہی بولتی ہے
نوائے دیدۂ بینا کو دل ترسے ہوئے ہیں
ہمارے منبروں سے کم نگاہی بولتی ہے
یقیں آتا نہیں اپنے ہی لہجے پر کبھی تو
یہ ہم کب ہیں، ہماری عذرخواہی بولتی ہے
ہمارے پانو کی زنجیر بولے یا نہ بولے
ہماری نسبتوں میں بادشاہی بولتی ہے
دعائیں کس طرف تاثیر کا خیمہ لگائیں
کہ چاروں کھونٹ اب تو بے پناہی بولتی ہے
ہمارے راستوں میں کھل گئیں دُشنام گاہیں
کہ گردِ راہ بھی واہی تباہی بولتی ہے
ہماری خاک پر الفاظ ہی واجب ہوئے ہیں
اسے ہے بولنا، چاہی نہ چاہی بولتی ہے

پرندے کس ٹھکانے لگ گئے ہیں
بکھرنے آشیانے لگ گئے ہیں
اب اس گھر کی کہانی اور ہوگی
یہاں بچے کمانے لگ گئے ہیں
غموں کو لگ گئیں کیسی زبانیں
کہ ہر سو چہچہانے لگ گئے ہیں
بڑے ہونا ابھی سیکھا نہیں ہے
بڑوں کو وہ سکھانے لگ گئے ہیں
کسے آنا ہے صاحب، آپ ایسے
ہمیں رکھنے اُٹھانے لگ گئے ہیں
کہاں سودا ہے یہ پہلی نظر کا
ہمارے تو زمانے لگ گئے ہیں

بے بسی کی مہک اس طرح زیرِ انفاس آنے لگی
لوگ سمجھے ہمیں حبس کی کیفیت راس آنے لگی
اور پھر یوں ہُوا، میرے لب بھی مرا دُکھ سمجھنے لگے
جب لبالب چھلکتے کٹوروں میں بھی پیاس آنے لگی
اپنے بچوں کو بھی لوگ سینے لگانے سے ڈرنے لگے
جب مساموں سے بے روح رشتوں کی بُو باس آنے لگی
پھر سمجھنا کہ بس اب بہاروں کے سب راستے کھل گئے
جب چٹانوں کی درزوں میں بھی سبزۂ گھاس آنے لگی
اُس نے میری طرف پا شکستہ تعلق روانہ کیا
ساتھ میں کچے دھاگے سے باندھی ہوئی آس آنے لگی
مائیں جب شیرخواروں کے سر سے کفن باندھنے لگ گئیں
زندگی پھر ذرا شرم کھاتی ہوئی پاس آنے لگی
کیوں تری وادیاں زرد ہونے لگیں، زندگی! ہوش کر
دیکھ کن پربتوں سے پگھلتی ہوئی یاس آنے لگی

جنگ لڑتے ہوئے کچھ خواب تھے آزو بازو
میرے بجھتے ہوئے مہتاب تھے آزو بازو
ایک افسانہ گذرتا گیا آنکھیں موندے
اور کھلتے ہوئے ابواب تھے آزو بازو
چشمِ پُرنم کے سبب تازہ و شاداب رہے
سارے قطعات جو بے آب تھے آزو بازو
آن کی آن میں جھرنا سا حرا سے پھوٹا
آن کی آن میں سیراب تھے آزو بازو
کشتیِ نوح تھا وہ ڈوبتی رُوحوں کے لیے
سرحدیں توڑتے سیلاب تھے آزو بازو
وسط میں نُورِ خدا اور ستاروں کی طرح
جگمگاتے ہوئے اصحابؓ تھے آزو بازو

یار بھی راہ کی دیوار سمجھتے ہیں مجھے
میں سمجھتا تھا مرے یار سمجھتے ہیں مجھے
جڑ اکھڑنے سے جھکاؤ ہے مری شاخوں میں
دور سے لوگ ثمربار سمجھتے ہیں مجھے
نیک لوگوں میں مجھے نیک گنا جاتا ہے
اور گنہگار، گنہگار سمجھتے ہیں مجھے
کیا خبر کل یہی تابوت مرا بن جائے
آپ جس تخت کا حق دار سمجھتے ہیں مجھے
روشنی سرحدوں کے پار بھی پہنچاتا ہوں
ہم وطن اس لیے غدار سمجھتے ہیں مجھے
وہ جو اس پار ہیں ان کے لیے اس پار ہوں میں
یہ جو اس پار ہیں اُس پار سمجھتے ہیں مجھے
میں بدلتے ہوئے حالات میں ڈھل جاتا ہوں
دیکھنے والے اداکار سمجھتے ہیں مجھے
جرم یہ ہے کہ ان اندھوں میں ہوں آنکھوں والا
اور سزا یہ ہے کہ سردار سمجھتے ہیں مجھے
میں تو یوں چپ ہوں کہ اندر سے بہت خالی ہوں
اور یہ لوگ پراسرار سمجھتے ہیں مجھے
چھاؤں دینے سے گریزاں ہیں کچھ ایسے جیسے
پیڑ سورج کا طرفدار سمجھتے ہیں مجھے
پاؤں میں خار لیے باغ میں بیٹھا ہوا ہوں
پھول خوشبو کا گرفتار سمجھتے ہیں مجھے
میں تو خود بکنے کو بازار میں آیا ہوا ہوں
اور دکاں دار خریدار سمجھتے ہیں مجھے
لاش کی طرح سرِ آب ہوں میں اور شاہدؔ
ڈوبنے والے مددگار سمجھتے ہیں مجھے

جدھر بھی دیکھیے اک راستہ بنا ہوا ہے
سفر ہمارے لیے مسئلہ بنا ہوا ہے
میں سربسجدہ سکوں میں نہیں سفر میں ہوں
جبیں پہ داغ نہیں آبلہ بنا ہوا ہے
میں کیا کروں مرا گوشہ نشین ہونا بھی
پڑوسیوں کے لیے واقعہ بنا ہوا ہے
مرے گنہ در و دیوار سے جھلک رہے ہیں
مکان میرے لیے آئنہ بنا ہوا ہے
مگر میں عشق میں پرہیز سے بندھا ہوا ہوں
ترا وجود تو خوش ذائقہ بنا ہوا ہے
شعوری کوششیں، منظر بگاڑ دیتی ہیں
وہی بھلا ہے جو بے ساختہ بنا ہوا ہے
بریدہ شاخیں ہیں یا شمع ہائے گل شدہ ہیں
خمیدہ پیڑ ہے یا مقبرہ بنا ہوا ہے
کسی دعا کے لیے ہاتھ اٹھے ہوئے شاہدؔ
کسی دیے کے لیے طاقچہ بنا ہوا ہے

زر سرشک فضا میں اچھالتا ہوا میں
بکھر چلا ہوں خوشی کو سنبھالتا ہوا میں
ابھی تو پہلے پروں کا بھی قرض ہے مجھ پر
جھجک رہا ہوں نئے پر نکالتا ہوا میں
یہ کس بلندی پہ لا کر کھڑا کیا ہے مجھے
کہ تھک گیا ہوں توازن سنبھالتا ہوا میں
حدِ زمان و مکاں بھی عبور کر آیا
خیال و خواب حقیقت میں ڈھالتا ہوا میں
وہ آگ پھیلی تو سب کچھ سیاہ راکھ ہوا
کہ سو گیا تھا بدن کو اجالتا ہوا میں
کسی جزیرۂ پر امن کی تلاش میں ہوں
خود اپنی راکھ سمندر میں ڈالتا ہوا میں
پچلوں کے ساتھ کہیں گھونسلے نہ گر جائیں
خیال رکھتا ہوں پتھر اچھالتا ہوا میں
بچھڑ گیا ہوں خود اپنے مقام سے شاہدؔ
بھٹکنے والوں کو رستے پہ ڈالتا ہوا میں

پہلے اعصاب کو بے کار کیا جائے گا
پھر ہمیں برسرِ پیکار کیا جائے گا
آپ بک جائیں گے اک دن اسی لاعلمی میں
آپ کے سامنے بیوپار کیا جائے گا
مجھے خدشہ ہے مسافر نہ رہے گا کوئی
جب تلک راستہ ہموار کیا جائے گا
اب تو سورج کی تمازت سے بدن جلتے ہیں
اب بھی کیا دھوپ سے انکار کیا جائے گا
تم نہ دیکھو بھی تو کب ملتوی ہوگا شاہدؔ
وہ تماشا جو پلک پار کیا جائے گا

سہیل ثاقب/سعودی عرب

عجب یادوں کا رشتہ روشنی سے ہم نے دیکھا ہے　　　چراغ دل بھڑک اُٹھا سرہانے شام جب آ

سہیل ثاقب نے تمام عمر دیارِ غیر میں گزار دی۔ جہاں اتنے ادبی مواقع نہیں ہوتے کہ آدمی اپنی شاعری کو مزید نکھار سکے۔ ادبی محفلوں سے کچھ حاصل کر سکے۔ اس کے باوجود سہیل ثاقب کی شاعری میں آج کے شاعر کے بھی تیور اور رنگ فراوانی سے نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری میں ندرت ہے، سوچ ہے برجستگی ہے۔

سہیل ثاقب کو میں شبابِ ثاقب اس سبب سے کہتا ہوں کہ یہ شاعری کے اُفق پر کچھ ہی دنوں میں مہ کامل بن کر ابھریں گے۔ میں ان کی کاوشوں اور کامرانیوں کے لیے دُعا گو ہوں۔

(امیر السلام ہاشمی)

کیسے کہہ سکتا ہے وہ گہرا نہیں
جو سمندر میں کبھی اُترا نہیں
ماں ترے قدموں میں ہے جنت مری
اور بخشش کا کوئی رستا نہیں
جان لو گے عشق کی بے تابیاں
تم نے اس کا معجزہ دیکھا نہیں
دل کشادہ ہم نے رکھا ہے سدا
اپنے لب پر مدعا رکھا نہیں
کیا بتاتے حالِ دل اس کو بھلا
اس نے تو ہم سے کبھی پوچھا نہیں
روز کا معمول ہے غارت گری
واقعہ یہ شہر کا پہلا نہیں
ظلم کی کیا حد نہیں ثاقب کوئی
اس طرح تو میری جاں ہوتا نہیں

میں جسے چاہوں اُسے میرا مقدر کر دے
تو دعاؤں کو مری اتنا مؤثر کر دے
کم سے کم دل مرا آئینہ بنایا ہوتا
میں نے کب چاہا تھا دل کو مرے پتھر کر دے
اپنے معیار سے گرنا نہیں منظور مجھے
رفعتِ شوق مرے قد کے برابر کر دے
کب کہا میں نے ستاروں کی طلب ہے مجھ کو
کب کہا میں نے کہ دریا کو سمندر کر دے
اک تسلسل میں کہاں تک میں جیے جاؤں گا
تو مرے صبر کی کچھ حد تو مقرر کر دے
چند لمحوں کو وہ آتا ہے چلا جاتا ہے
ہے یہی وصل تو پھر ہجر مقدر کر دے
پہلے یہ دیکھ خطا کس سے ہوئی ہے ثاقب
جرم ثابت جو مرا ہو تو قلم سر کر دے

ٹھکرا کے اپنی ساری تب و تاب آ گئے
محفل میں لے کے ہم دلِ بے تاب آ گئے
ہم سے لکھے گئے نہ کسی طور آج تک
ایسے بھی اس کہانی میں کچھ باب آ گئے
جاگا تو مجھ سے روٹھ کے جانے کہاں گئے
سویا تو مجھ کو لینے مرے خواب آ گئے
اُس کی گلی میں جا کے تو کچھ بھی نہیں ملا
بے تاب ہی گئے تھے سو بے تاب آ گئے
بچوں نے جو گھروندے بنائے تھے ریت کے
موجوں کی شوخیوں سے تہہ آب آ گئے
آباء کے نقش پا پہ چلے ہیں تمام عمر
یہ کم نہیں کہ جینے کے آداب آ گئے

ساز ہو جیسے کوئی مضراب کی تحویل میں
لفظ رہتے ہیں سدا اعراب کی تحویل میں
اور کیا اس سے بھلا اُمید رکھے گا کوئی
خواب ہی دیکھے گا جو ہے خواب کی تحویل میں
تشنہ لب پہنچے تھے تشنہ لب ہی واپس آئے ہیں
صرف مٹی ہی ملی مہتاب کی تحویل میں
وہ بھلا سمجھے گا کیا آبِ رواں کی لذتیں
عمر جس نے کاٹ دی تالاب کی تحویل میں
کل تلک تو جانور رہتے تھے اُس کی قید میں
آج کل انسان ہیں قصاب کی تحویل میں
جس نے اپنا گھر گرا کر راستہ اُس کو دیا
آ گیا وہ شخص بھی سیلاب کی تحویل میں
کل کا کیا ہوگا خبر اس کی نہیں ثاقب مگر
آج کا انسان ہے اسباب کی تحویل میں

ہو رہی ہے اُتھل پتھل مجھ میں
اے مرے دل نہ یوں مچل مجھ میں
تو ہے پتھر تو پھر برس مجھ پر
گر ہے تو موم تو پگھل مجھ میں
میں اُلجھنے لگا ہوں اب خود سے
کس نے ڈالے ہیں اتنے بل مجھ میں
اے مرے قلبِ ناتواں سن لے
خاک ہو جاؤں گا سنبھل مجھ میں
میر کا بس خیال آیا تھا
اور اُترنے لگی غزل مجھ میں
سو نہ پایا میں رات بھر ثاقب
کیسی ہلچل ہے آج کل مجھ میں

افضل خان/ بہاول پور

اب کے جس وحشت میں گھر کو چھوڑا ہے
جی کرتا ہے پھینک دوں چابی دریا میں

ہوا کا شکریہ اس نے دھواں جانا ہے مجھ کو
وگرنہ مسئلہ یہ تھا کہاں جانا ہے مجھ کو
یہ محرومی بھی میرے پاؤں سے لپٹی ہوئی ہے
جہاں میں جا نہیں سکتا وہاں جانا ہے مجھ کو
مجھے پٹ دے گا اک دن رازداری کا یہ ملبہ
مرے احباب نے اندھا کنواں جانا ہے مجھ کو
بھلا کس بات پر یہ زندگی اترا رہی ہے
وہیں جانا ہے اس کو بھی جہاں جانا ہے مجھ کو
محبت کی، غم نان و نمک کی، شاعری کی
مثلث کھینچتی ہے ناگہاں جانا ہے مجھ کو
مجھے ہر لہر باری باری کاندھا دے رہی ہے
نظارہ کرنے والوں نے رواں جانا ہے مجھ کو

ختم ہوئی آخر بے خوابی دریا میں
ڈوب گئی ہے اک مرغابی دریا میں
اب کے جس وحشت میں گھر کو چھوڑا ہے
جی کرتا ہے پھینک دوں چابی دریا میں
میں تو کب سے اس کو آگ لگا دیتا
لیکن کچھ مخلوق ہے آبی دریا میں
میں جو یہاں روزانہ آتا جاتا ہوں
پنہاں ہے میری سیرابی دریا میں
اک دن میں جذبات کی رو میں بہہ نکلا
پھول بہائے چند گلابی دریا میں
اپنے کنارے خود ہی کاٹنے لگتا ہے
پڑ جاتی ہے روز خرابی دریا میں

دل اس کی یاد میں جس شب ملول ہو جائے
ہمارے واسطے بستر ببول ہو جائے
اب اس کے بعد مروت کا موڑ آئے گا
اسی مقام پہ رد و قبول ہو جائے
زباں کی جنگ تو شاید نہ تھم سکے پھر بھی
بزرگ جمع ہیں حلف الفضول ہو جائے
خدا سے سیکھئے اُلفت کی انتہا کہ جہاں
جو آخری ہو وہ پہلا رسول ہو جائے
بدن کے غار حرا میں خموش بیٹھا ہوں
کہ شاید ایسے غزل کا نزول ہو جائے
صلہ بس اتنا ملے سانس لینے والوں کو
کہ زیر و بم کی مشقت وصول ہو جائے
جناب قیس کا مجھ کو لحاظ ہے ورنہ
یہ دشت ایک ہی ٹھوکر میں دھول ہو جائے

اُڑنے والا ہوں میں ہر نقش بدن پر باندھے
اب کے یہ خلق مرے پاؤں نہیں، پر باندھے
یہی تعریف ہے اب اہل نظر میں اپنی
ایسا ناداں کہ جو ہونی کو بھی مصدر باندھے
کیا مزا ہو کہ ترے دل میں ٹھہرنے والا
عہد کے بدلے اگر بوریا بستر باندھے
عمر بھر اس کے لیے ڈھنگ کا مصرع نہ بندھا
جس کے شانوں پہ کھلے زُلف تو منظر باندھے
میرے بس میں تو نہ ہوگا تہہ دریا رہنا
اس کو سمجھاؤ مرے جسم سے پتھر باندھے
میں سگ دل ہوں تو دل بھی ہے سگ عشق افضل
جو مجھے روز کسی دھیان سے بندھ کر باندھے

جب اک سراب میں پیاسوں کو پیاس اُتارتی ہے
مرے یقیں کو قرین قیاس اُتارتی ہے
میں سیخ پا ہوں بہت زندگی کی گاڑی پر
یہ روز شام مجھے گھر کے پاس اُتارتی ہے
ہمارا جسم سکوں چاہتا ہے اور یہ رات
تھکن اُتارنے آتی ہے ماس اُتارتی ہے
یہ زندگی تو لبھانے لگی ہمیں ایسے
کہ جیسے کوئی حسینہ لباس اُتارتی ہے
ہمارے شہر کی یہ وحشیانہ آب و ہوا
ہر ایک روح میں جنگل کی باس اُتارتی ہے
تمہارے آنے کی افواہ بھی سر آنکھوں پر
یہ بام و در سے اُداسی کی گھاس اُتارتی ہے

واصف سجاد/ساہی وال

کہ جس میں مرکزی کردار خاکسار کا ہے
خدا نے لکھی ہے وہ داستان میرے لیے

واصف سجاد خوبصورت لہجے کے توانا شاعر ہیں۔ اُن کی غزل تخلیقی حسن کا عمدہ ترین اظہار ہے۔ ان کے ہاں جہاں رومانوی خیالات اپنی پوری آب وتاب دکھا رہے ہیں وہاں عہد حاضر سے جڑے ہوئے موضوعات بھی بھرپور انداز میں اپنی جلوہ گری دکھا رہے ہیں۔ واصف سجاد شہرِ غزل ''ساہیوال'' میں مقیم ہیں۔ اس دھرتی نے علم وادب سے تعلق رکھنے والی بہت سی سربرآوردہ اور مقتدر شخصیات کو جنم دیا ہے۔ واصف بھی اسی سخن آثار بستی کا باسی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی شاعری میں انھیں فضاؤں کی خوشبو رچ بس گئی ہے جن کی مہک نے اس سے پیشتر مجید امجد، منیر نیازی، جعفر شیرازی، بشیر احمد بشیر، گوہر ہوشیارپوری، ڈاکٹر خورشید رضوی، ڈاکٹر سہیل احمد خاں، ڈاکٹر سعادت سعید، طارق عزیز، سجاد میر، سید ناصر شہزاد اور دیگر کی شاعری کو تخلیقی اور فنی دوام بخشا تھا۔

اپنے اپنے عذاب میں ہم تھے
کب کسی انتخاب میں ہم تھے
جس کی تعبیر ہی نہ تھی ممکن
ایک ایسے ہی خواب میں ہم تھے
سرسری طور پر پڑھا سب نے
کیا نصابی کتاب میں ہم تھے
کوئی بھی چیز کیوں بھلی نہ لگی
کس جہانِ خراب میں ہم تھے
کیسی تبدیلیوں کی خواہش تھی
اور کس انقلاب میں ہم تھے
دو گھڑی تھا تمام ہنگامہ
یعنی چشمِ حباب میں ہم تھے

آئینہ سمان بن گئے ہیں
حیرت کا جہان بن گئے ہیں
ہم لوگ مثال بنتے بنتے
عبرت کا نشان بن گئے ہیں
تھے کتنے یقین اپنے دل میں
اب سارے گمان بن گئے ہیں
اس دور میں فکر وفن کے رسیا
سب ہیچمدان بن گئے ہیں

سبزہ نظر آئے گا کہاں اب
ہر سمت مکان بن گئے ہیں

نکلیں گے بے یقینی کے گہرے عذاب سے
گر رابطہ بحال ہو اپنا کتاب سے
میں جانتا ہوں تیری حقیقت جہان تو
مرعوب میں نہیں ہوں تری آب وتاب سے
امروز کے عذاب میں جو مبتلا ہے خلق
بہلا رہے ہیں سب اسے فردا کے خواب سے
کیا دے انہیں سکون کوئی لمحہ فراغ
لذت کشید کرتے ہیں جو اضطراب سے
چھن چھن کے آ رہی ہے تب وتاب زندگی
پردہ سرک رہا ہے رُخِ انقلاب سے

کس طور کی آگہی بہت ہے
کم شعر ہیں، شاعری بہت ہے
قائل ہیں وہ آپ روشنی کے
کہتے ہیں جو تیرگی بہت ہے
رخ کا چلو ذکر تو ہے اس میں
ہم کو تری بے رُخی بہت ہے

کیا جانے ہوا بہت دنوں سے
لہجے میں شگفتگی بہت ہے
اے خالق کائنات کیونکر
مخلوق تری دکھی بہت ہے

زمین میرے لیے، آسمان میرے لیے
بنا ہے سارے کا سارا جہان میرے لیے
بچھے ہوئے ہیں یہ سب راستے مری خاطر
اور ان میں راہنما ہر نشان میرے لیے
کہ جس میں مرکزی کردار خاکسار کا ہے
خدا نے لکھی ہے وہ داستان میرے لیے
چلو ہم اس پہ بھی خوش ہیں اگر بنیں اک ساتھ
تمہارے واسطے گھر اور مکان میرے لیے
بہت ہی سوچ سمجھ کر گزارنا ہے اسے
کہ یہ حیات ہے اک امتحان میرے لیے
میں اوجِ انجم و مہتاب سے نہیں مرعوب
ہے ان سے بڑھ کے مرا خاکدان میرے لیے

سیّد انوار احمد ڈاکٹر/امریکہ

یہ سنگ خود نہیں آئے تو کون پھینک گیا
یہ خواب خود نہیں ٹوٹے تو کس نے توڑے ہیں

راحت کے واسطے نہ رفاقت کے واسطے
اب کوئی مجھ کو چاہے تو چاہت کے واسطے
یہ اختلافِ فکر بہت کام آئے گا
اس کو بچا کے رکھ کسی ساعت کے واسطے
دونوں کو اس جہان میں سچ کی تلاش تھی
اتنا بہت تھا ہم میں رفاقت کے واسطے
میں خواہشِ قیام سے آگے نکل گیا
اب مجھ کو مت پکار اِقامت کے واسطے
منزل مری سفر ہے، مرا زادِ راہ بھی
میں چل رہا ہوں آج مسافت کے واسطے
وہ سانپ تھا اور اس کو سپیرے سے پیار تھا
اتنا بہت تھا اُس کی ہلاکت کے واسطے

یاد اُس کی پورا چاند تھی، لمحے سحاب تھے
چھن کر زمیں پہ گرتے ہوئے میرے خواب تھے
یہ آج میرے واسطے کاغذ کے پھول کیوں
اُس دن تو تیرے ہاتھ میں تازہ گلاب تھے
اک عمر یوں ہوا ہے کہ ہر لمحہ میرے ساتھ
تیرے ملن کی آس تھی اور تیرے خواب تھے
گھر کو لٹا کے آئے تھے ہم کتنے ناز سے
لیکن سبھی کی آنکھ میں خانہ خراب تھے
وہ مجھ سے پوچھنے لگا میرے سوال اَب
اور میں بھی دے رہا ہوں جو اس کے جواب تھے

حالِ دل کس سے کہہ سکے کوئی
یہ تو تب ہے کہ جب سنے کوئی
اس لیے اس کو دیکھے جاتا ہوں
میں نے دیکھا ہے دیکھ لے کوئی
یہ تسلسل ہی حسن ہے میرا
مجھ کو قسطوں میں مت پڑھے کوئی
دل میں تو سو طرح کے شکوے ہیں
سامنے اُن کے کیا کہے کوئی
کون سچا ہے، کون جھوٹا ہے
ایسے جھگڑوں میں کیا پڑے کوئی
ان سے آوازِ کرب آتی ہے
زرد پتوں پہ مت چلے کوئی
دیپ چوکھٹ پہ اک جلا دینا
آ بھی سکتا ہے دن ڈھلے کوئی

دن، شام، رات، ہفتے، مہینے، برس گئے
یہ نین تیری دید کو جاناں ترس گئے
رسماً تو پوچھتا ہے مرا حال، جب ملے
لیکن اب اُس کے لہجے سے وہ میٹھے رس گئے
میں نے فلک پہ دیکھا ستاروں کو ٹوٹتے
اور پھر یہ دیکھا آپ کی آنکھوں میں بس گئے
وہ چاندنی میں ڈھل کے کھلے ہاتھ یاد ہیں
پر اُن حسیں گلابوں کے نازک سے مس گئے
تجھ کو بھی کچھ ضرورتیں برباد کر گئیں
مجھ کو بھی میری خواہشوں کے سانپ ڈس گئے

اجداد کے لہو نے جسے پاک کر دیا
ہم نے پھر ایک بار اُسے خاک کر دیا
اب میرے حق کو چھیننا آساں نہیں رہا
صدیوں کی بھوک نے مجھے چالاک کر دیا
اپنے لیے بھی کوئی رعایت روا نہیں
اس منصفی کی خو نے تو سفاک کر دیا
گو تیرنا تو مجھ کو بھی آتا نہ تھا مگر
اک ماں کی تیز چیخ نے پیراک کر دیا
جس کی تمام سختیاں میں ہنس کے سہہ گیا
آج اُس کے نرم لہجے نے نمناک کر دیا

حسین شام کے وعدے یہ کہہ کے موڑے ہیں
کبھی کبھی کے یہ تحفے بہت ہی تھوڑے ہیں
یہ ایک لمحہ جو یوں سر جھکائے جاتا ہے
اس ایک پل کے لیے کتنے سال جوڑے ہیں
تھکے تھکے ہی سہی، قافلے کے ساتھ رہے
مٹے مٹے ہی سہی نقش کچھ تو چھوڑے ہیں
یہ سنگ خود نہیں آئے تو کون پھینک گیا
یہ خواب خود نہیں ٹوٹے تو کس نے توڑے ہیں

مختار جاوید/لاہور

ہمارے ہاتھ جکڑ دو زبانیں سی ڈالو مگر یہ ذہن تو زنجیر ہو نہیں سکتے

مختار جاوید ایک پختہ اور منجھے ہوئے شاعر ہیں۔ ان کا تعلق پاکستان کے مردم خیز خطہ جہلم سے ہے۔ ان کے کلام میں دریائے جہلم جیسی روانی اور خیالات کا تربیلا ڈیم جیسا ذخیرہ ہے۔ زمانہ شناسی میں مکمل دسترس رکھتے ہیں۔ ملک کے تمام معروف شعراء کے ساتھ تعلق رہا۔ جناب احمد ندیم قاسمی سے خاص عقیدت تھی اور ہے۔ اسی نسبت سے ان کی تنظیم "حلقہ اربابِ ذوق" کے باقاعدہ ممبر ہونے کے علاوہ جہلم میں ایک شاخ قائم کر رکھی ہے اور باقاعدگی سے ماہانہ نشست کا اہتمام ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ جناب احمد فراز، احمد ندیم قاسمی، منیر احمد نیازی، امجد اسلام امجد کے ساتھ نیازمندی کے ساتھ ساتھ ان کے ہمراہ مشاعرے پڑھنے کا بھی اعزاز حاصل ہے۔ غزل گو شاعر ہیں اور غزل ہی ان کی پسندیدہ صنف ہے۔ اسی حوالے سے ان کا شعری مجموعہ "زمین پر کہکشاں" منظر عام پر آ کر داد و تحسین پا چکا ہے۔ علم عروض پر بھی عبور حاصل ہے۔ مرزا غالب اور اقبال کو پسندیدہ شاعر قرار دیتے ہیں۔ اہلِ ذوق کو نمونہ کلام پڑھنے کی دعوت ہے۔ (ناز اوکاڑوی) ناز اوکاڑوی

حسرت ہماری مفت میں پامال ہوگئی
بکنے گئے تو شہر میں ہڑتال ہوگئی
اُوپر سے آسمان ہی خالی نہیں ہوا
نیچے سے یہ زمین بھی کنگال ہوگئی
چہرے پہ درج خوف کو رہزن نے پڑھ لیا
رستے میں زادِ راہ کی پڑتال ہوگئی
گرنا تو تھا کہ ٹوٹ گئے آسماں سے ہم
اپنے لیے زمین بھی پاتال ہوگئی
خود پہ جو اعتماد تھا وہ بھی نہیں رہا
کتنی عجیب صورتِ احوال ہوگئی
غفلت کے باوجود بھی کچھ نہیں ہوا
محتاط ہو گئے تو کوئی چال ہوگئی
بازار میں اناج کے گودام بھر گئے
چڑیا ہمارے صحن کی خوشحال ہوگئی

جدھر چراغ جلائے اُدھر ہوا کر دے
کسے خبر ہے زمانے! تو کیا سے کیا کر دے
ہر آدمی کی دعاؤں کا مدعا یہ ہے
جو کام اس کے ہیں کرنے کے وہ خدا کر دے
مجھے یہ پاؤں اُڑاتے نہیں پروں کی طرح
کوئی پہاڑ مرے سامنے کھڑا کر دے
مرے خدا! کوئی جگنو ہی بھیج دے جو مجھے
اُدھر اُدھر کے اندھیروں سے آشنا کر دے

اک آرزو ہے کہ دیکھوں قفس کو غیر آباد
یہ ہاتھ پاؤں جکڑ کر مجھے رہا کر دے
تجھے ملی ہے فقیری تو اس میں بخل نہ کر
اُٹھا کے ہاتھ کسی کے لیے دعا کر دے
زبان بند رہے بات ہو تو سکتی ہے
ہماری بات اگر کوئی دوسرا کر دے
بہت عزیز ہے مجھ کو مرا پرانا پن
تو چاہے تو مرے بچے اسے نیا کر دے

معیار کو اُٹھاؤں تو کردار گر پڑے
چھت کو سنبھالتا ہوں تو دیوار گر پڑے
تو اور کیا بلند ہو، میں اور کیا کروں
دیکھوں بھی تیری سمت تو دستار گر پڑے
ایسا کوئی کمال کہ میدانِ جنگ میں
ہر جنگ جو کے ہاتھ سے تلوار گر پڑے
اتنا ہوا کہ رزق سمندر نہیں ہوئے
اس پار گر پڑے کبھی اُس پار گر پڑے
دیکھا پلٹ کے تو کہیں پیچھے کھڑا تھا وہ
جیسے کسی کے پاؤں سے رفتار گر پڑے
بے حوصلہ نہیں تھا کوئی اک بھی ڈار میں
دو چار اُوپر اُٹھ گئے دو چار گر پڑے

اُس کے نہیں ہوئے جو ہمارا نہیں ہوا
ہم سے ادھورا عشق گوارا نہیں ہوا
ذرہ بنا کے چھوڑ دیا کیوں زمین پر
کیوں میں کسی کی آنکھ کا تارا نہیں ہوا
چاہت بلندیوں کی تھی لیکن خدا کا شکر
انسان ہی رہا ہوں غبارا نہیں ہوا
تھوڑی ہی دیر کے لیے زندہ ہوا تھا میں
سینے میں ارتعاش دوبارہ نہیں ہوا
غائب ہوئے تھے ہم تو قطارات چھوڑ کے
ظاہر ہوئے تو دن بھی ہمارا نہیں ہوا

اِدھر گئی، نہ اُدھر، پھر کدھر گئی دُنیا
یہ الگ بات کہ حد سے گزر گئی دنیا
کوئی مقام بنانے میں ہوگئی ناکام
کسی پڑاؤ پہ جا کے ٹھہر گئی دُنیا
تری تلاش تو دنیا کو بھی رہی لیکن
ہماری طرح نہیں دربدر گئی دُنیا
خدا کا شکر کہ تحریر میں نہ آئی تھی
وہ بات جس سے مکر گئی دنیا
ہمارے ہاتھ میں کیا عمر تھی جوانی کی
ہمارا ہاتھ لگا تو سنور گئی دنیا

سرور ارمان/نارووال

یوں جذبہ ہائے دل کے الاؤ ہیں منجمد　　　　جیسے کبھی کسی کی طلب ہی نہ تھی ہمیں

سرور ارمان عرصہ دراز سے شاعری کے سفر میں ہیں۔ اس عرصہ میں انہوں نے اپنے راستے میں "سراب مسلسل"، "زنجیر بولتی ہے"، "تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو" کے نشاں چھوڑے ہیں۔ اسی پگڈنڈی پہ چلتے ہوئے ایک اور منزل تلاش کرتے ہوئے "وہی آبلے مرے پاؤں کے" نشان ڈھونڈے ہیں۔ کہنہ مشق شاعر ہیں اور مسلسل سفر میں ہیں۔ ابھی انہوں نے اور راہیں اور منزلیں تلاش کرنی ہیں۔ اپنے اس مجموعہ میں جہاں غزلوں کی نئی جہتیں تلاش کی ہیں وہاں نظموں کو بھی نئی طرز سے آشکارا کیا ہے۔ سرور ارمان کے کلام میں روایت ہے تو کہیں کہیں جدت بھی ملتی ہے۔

بے لوث دعاؤں کا احسان نہیں لیتے
بچے اب ماؤں کا احسان نہیں لیتے
جی لیتے ہیں جسموں پر ہم اوڑھ کے زخموں کو
خوش رنگ قباؤں کا احسان نہیں لیتے
ہم لوگ بھی پاگل ہیں تپتے ہوئے صحرا میں
خیرات کی چھاؤں کا احسان نہیں لیتے
ہم ریت گھروندوں کی اوقات ہے اتنی سی
بس تیز ہواؤں کا احسان نہیں لیتے
جا اپنی وفاؤں کو اب بانٹ فقیروں میں
ہم ایسی وفاؤں کا احسان نہیں لیتے

شجر باہیں تو پھیلائے ہوئے تھے
ہمی سایوں سے گھبرائے ہوئے تھے
کہیں گلزار تھے محروم نکہت
کہیں خورشید گہنائے ہوئے تھے
کسی کی آرزوئیں نوحہ گر تھیں
کسی کے خواب زخمائے ہوئے تھے
جو خود بے پیرہن تھے انجمن میں
ہمیں آئینہ دکھلائے ہوئے تھے
ترا پیغام بھی اس وقت آیا
ہمیں جب دردراس آئے ہوئے تھے

کھنڈر کھودا گیا جس زاویے سے
وہیں ہم لوگ دفنائے ہوئے تھے
تجارت بن گئی تھی آدمیت
دکانوں پر ضمیر آئے ہوئے تھے

شبوں کی روشنیاں چھن کر قبیلوں سے
سویرے جھانک رہی تھی اداس ٹیلوں سے
ملا جو حکم رہائی تو جاں نثار ترے
لپٹ کے روتے رہے جیل کی فصیلوں سے
وہاں تلاش نہ کر رونقیں جبینوں پر
ضرورتیں ہوں سوا جس جگہ وسیلوں سے
کہا کہ ڈوبنا کس کس کا کوئی یاد رکھے
سوال جب بھی کیا پر سکون جھیلوں سے
بدل چکے تھے کہیں اور مجرموں کے نصیب
لواحقین الجھتے رہے وکیلوں سے

یاد آ نہ جائے عہد گزشتہ کبھی ہمیں
لینے نہ دے گی چین کہیں زندگی ہمیں
یوں جذبہ ہائے دل کے الاؤ ہیں منجمد
جیسے کبھی کسی کی طلب ہی نہ تھی ہمیں
چہرے کی فکر تھی تو کوئی جانتا نہ تھا
پہچان دے گئی ہے یہ بے چہرگی ہمیں

آنکھوں کو اپنے خواب مقدم نہیں رہے
مہنگی پڑی ہے شہر کی منظر کشی ہمیں
کرتے رہو گے کیا یونہی توہین آدمی
دیتے رہو گے بھیک میں کیا روشنی ہمیں

اب وہ خوشیاں کہاں، ملال کہاں
عمر رفتہ کے ماہ و سال کہاں
صبح کے دل نواز ماتھے پر
ضوفشاں سرخیٔ جمال کہاں
دوستی اپنے آپ سے کر لی
ڈھونڈتے ہم شریک حال کہاں
وضع داری عزیز تھی اتنی
کرنے دیتی ہمیں سوال کہاں
بن گئے روح کی غذا یہ زخم
اب انہیں خوئے اندمال کہاں
بھیس ہی اس قدر مکمل تھا
ہم سمجھتے تمہاری چال کہاں
وار احباب کے رویوں کا
روک سکتی تھی کوئی ڈھال کہاں

عمران شناور/چشتیاں

لوگ پابند سلاسل ہیں مگر خاموش ہیں   بے حسی چھائی ہے ایسی گھر کے گھر خاموش ہیں

ہر نیا شاعر جدید شاعر ہوتا ہے۔ اس کا لب ولہجہ اور اس کے خیالات وجذبات تازہ کاری سے مزین ہوتے ہیں پھر رفتہ رفتہ وہ روایت کی طرف مائل ہوتا ہے کیونکہ غزل کی اساس بھی اور غزل کی منزل بھی روایت سے جڑی ہوئی ہے جیسے جیسے تجربے اور مشاہدے میں پختگی آتی ہے غزل کی روایت مضبوط ہوتی چلی جاتی ہے۔ عمران شناور بھی غزل کی خوبصورت روایتوں کی پاسداری کرتے ہوئے نئے آہنگ سے شاعری کو آشنا کرتا ہے۔ محبت کے رنگ میں رچی بسی شاعری دلوں کو تسخیر کرتی ہے اور شاعر کو مشہور کرتی ہے۔ عمران شناور کی شاعری میں محبت کی کئی بستیاں آباد ہوتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ نئی نئی بستیوں میں زندگی کا اپنا ایک لطف ہوتا ہے۔ شہر گنجان ہو جائیں تو ان کے شور وشر میں بہت سی آوازیں دب کے رہ جاتی ہیں۔

عمران شناور کی شاعری میں استادانہ چالاکیاں نظر نہیں آتیں مگر اس کے الفاظ کی اپنی دروبست ایسی ہے کہ قاری اس کے حصار میں کھنچا چلا آتا ہے۔ اس کی شاعری میں ہمیں اپنے معاشرے کے دکھوں کی روداد بھی ملتی ہے اور شاعر کی واردات قلب بھی۔ اس امتزاج نے عمران شناور کی شاعری کو مقبولِ عام بنا دیا ہے۔

کچھ تو اے یار! علاجِ غمِ تنہائی ہو
بات اتنی بھی نہ بڑھ جائے کہ رسوائی ہو
ڈوبنے والے تو آنکھوں سے بھی کب نکلے ہیں
ڈوبنے کے لیے لازم نہیں، گہرائی ہو
جس نے بھی مجھ کو تماشا سا بنا رکھا ہے
اب ضروری ہے وہی شخص تماشائی ہو
میں محبت میں لٹا بیٹھا ہوں دل کی دنیا
کام یہ ایسا بھی کب ہے کہ پذیرائی ہو
اجنبی تم سے کوئی بات جو کر لی میں نے
لوگ کہنے لگے ہرجائی ہو، ہرجائی ہو
کوئی انجان نہ ہو شہرِ محبت کا مکیں
کاش ہر دل کی ہر اک دل سے شناسائی ہو
میں محبت کو چھپاتا رہا لیکن بے سود
بات چھپتی ہے کہاں جس میں کہ سچائی ہو
آج تو بزم میں ہر آنکھ تھی پرنم جیسے
داستاں میری کسی نے یہاں دہرائی ہو
میں تجھے جیت بھی تحفے میں نہیں دے سکتا
چاہتا یہ بھی نہیں ہوں تری پسپائی ہو
اب کے ساون تو برستا ہوا یوں لگتا ہے
آسماں پر بھی ترے غم کی گھٹا چھائی ہو
یوں گزر جاتا ہے عمرانؔ ترے کوچے سے
تیرا واقف نہ ہو جیسے کوئی سودائی ہو

لوگ پابندِ سلاسل ہیں مگر خاموش ہیں
بے حسی چھائی ہے ایسی گھر کے گھر خاموش ہیں
دیکھتے ہیں ایک دوجے کو تماشے کی طرح
ان پہ کرتی ہی نہیں آہیں اثر' خاموش ہیں
ہم حریفِ جاں کو اس سے بڑھ کے دے دیتے جواب
کوئی تو حکمت ہے اس میں ہم اگر خاموش ہیں
اپنے ہی گھر میں نہیں ملتی اماں تو کیا کریں
پھر رہے ہیں مدتوں سے دربدر' خاموش ہیں
ٹوٹنے سے بچ بھی سکتے تھے یہاں سب آئنے
جانے کیوں اس شہر کے آئینہ گر خاموش ہیں
پیش خیمہ ہے شناورؔ یہ کسی طوفان کا
سب پرندے اڑ گئے ہیں اور شجر خاموش ہیں

ستارے سب مرے' مہتاب میرے
ابھی مت ٹوٹنا' اے خواب میرے
ابھی اڑنا ہے مجھ کو آسماں تک
ہوئے جاتے ہیں پر بے تاب میرے
میں تھک کر گر گیا' ٹوٹا نہیں ہوں
بہت مضبوط ہیں اعصاب میرے
ترے آنے پہ بھی بادِ بہاری
گلستاں کیوں نہیں شاداب میرے
بہت ہی شاد رہتا تھا میں جن میں
وہ لمحے ہو گئے نایاب میرے
ابھی آنکھوں میں طغیانی نہیں ہے
ابھی آئے نہیں سیلاب میرے
سمندر میں ہوا طوفاں بپا
سفینے آئے زیرِ آب میرے
تُو اب کے بھی نہیں ڈوبا شناورؔ
بہت حیران ہیں احباب میرے

بھوک کم کم ہے' پیاس کم کم ہے
اب تو جینے کی آس کم کم ہے
سانس لیتے تھے ہجر موسم میں
اب یہ موسم بھی راس کم کم ہے
تتلیاں اڑ گئیں یہ غم لے کر
اب کے پھولوں میں باس کم کم ہے
دل جو ملنے کی ضد نہیں کرتا
اب یہ رہتا اداس کم کم ہے
اپنی حالت اسے بتا نہ سکوں
وہ جو چہرہ شناس کم کم ہے

علی نقوی — میانوالی

مجھ سے بچھڑا تو بہت ٹوٹ گیا تھا لیکن — اُس کے لہجے میں وہ دیوارِ انا باقی تھی

علی نقوی کا کلام میں پہلی بار پڑھ رہا ہوں۔ سادہ، آسان اور عام فہم زبان میں لکھی ہوئی غزلیں اچھی لگی ہیں۔ اُس کی شاعری کے تیور بتاتے ہیں اُسے مستقبل میں بہت اچھا شاعر بننا ہے۔ میں اس نوجوان کو صرف یہ نصیحت کروں گا کہ شعر کے سفر میں کہیں بھی مطمئن ہو کر بیٹھ نہ جانا بلکہ عمر بھر مطالعہ اور ریاضت کا سفر جاری رکھنا۔ ربِ سخن تمھیں اس کا صلہ ضرور دے گا۔ عمر بھر شاعر ایک شعر کی تلاش میں سفر کرتا ہے۔ وہ شعر عمر کے کسی حصے میں ضرور نصیب ہوتا ہے۔ کام اور نام کو زندہ رکھنے کے لیے وہ ایک شعر ہی کافی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات تمہارے لکھے لفظوں کو معتبر بنائے۔ (آمین) (عطاء الحق قاسمی)

ہر شب یونہی نیندوں سے جگا دیتا ہے کوئی
پلکوں پہ نئے خواب سجا دیتا ہے کوئی
اک یاد کی ظلمت میں چراغوں کو بجھا کر
اشکوں کو سرِ شام جلا دیتا ہے کوئی
سب کو ہی خبر تھی کہ نہ اب لوٹ سکوں گا
پھر بھی مجھے ہر گام صدا دیتا ہے کوئی
جب جب بھی وفاؤں پہ کوئی بات کہی ہے
مجھ کو میری نظروں سے گرا دیتا ہے کوئی
اک حرفِ غلط ہوں جسے قرطاسِ دہر پہ
لکھتا ہے مگر پھر سے مٹا دیتا ہے کوئی
ہے جرمِ محبت کی سزا ہجر، اذیت
اک بھول کی اتنی بھی سزا دیتا ہے کوئی؟
نقوؔی تیرے کوچے میں عجب رسم چلی ہے
پھولوں کو بہاروں میں جلا دیتا ہے کوئی

عشق محبت چاہت بھی اور پیار بھی تم ہو
من کی خاموشی میں اک گفتار بھی تم ہو
ان طلائی سکوں کی کیا قیمت جاناں
میرے لیے تو دولت کا انبار بھی تم ہو
اس دنیا سے کوسوں دور نکل جاتا میں
میرے رستے میں حائل دیوار بھی تم ہو
جس کو دیکھ کے یونہی پلکیں جھک جاتی ہیں
شرم و حیا میں پنہاں وہ کردار بھی تم ہو
میرے پاس تو جو کچھ ہے وہ سب تیرا ہے
حتیٰ کہ جیون میں حصہ دار بھی تم ہو
جاگی جاگی آنکھوں میں تیرا پرتو ہے
نقوؔی میرے سپنوں کے اس پار بھی تم ہو

ذرّے کی کائنات سے گوہر تلاش کر
جلتی ہوئی زمیں میں سمندر تلاش کر
تشنہ لبی میں ساحلِ دریا کے خواب بن
تاریکیوں میں دُھوپ کا منظر تلاش کر
مسجد نہ مندروں میں خدا کا کوئی نشاں
اُس کو فصیلِ ذات کے اندر تلاش کر
دشمن کے لشکروں سے صفِ دوستاں میں آ
اپنوں کی آستین سے خنجر تلاش کر
جس پر لٹا سکے تو محبت کی چاندنی
وہ خال و خود وہ حسن وہ پیکر تلاش کر
رستہ بھٹک نہ جائے کہیں منزلوں کا تو
اس شہرِ پُرفریب میں رہبر تلاش کر
نقوؔی نہ موم ہے نہ ہی مٹی نہ بوئے گل
اس کو تراشنا ہے تو پتھر تلاش کر

آنکھوں میں حیرانی کیوں ہے
وہ صورت انجانی کیوں ہے
چاند کی کرنیں مدھم مدھم
بھیگی شام سہانی کیوں ہے
جن آنکھوں میں خواب سجے تھے
ان آنکھوں میں پانی کیوں ہے
لہروں میں بھونچال ہے کیسا
دریا میں طغیانی کیوں ہے
اس کی یادیں بھی کہتی ہیں
اس گھر میں ویرانی کیوں ہے
یہ تو بتا اے درد کہ تجھ پہ
ہر دم ایک جوانی کیوں ہے
پیار کیا تو اب جگنو بھی
کی ایسی نادانی کیوں ہے
اس اک پاگل شخص کی خاطر
اک دنیا دیوانی کیوں ہے
پیار میں اُجڑے سب لوگوں کی
نقوؔی ایک کہانی کیوں ہے

فاخر رضوی / جرمنی

خواہشیں اوڑھ کر چلا آیا
میں تجھے چھوڑ کر چلا آیا
اک مدت سے میری تاک میں تھا
غم ترا دوڑ کر چلا آیا
آدھا چہرا دکھاتا تھا سو میں
آئنہ توڑ کر چلا آیا
میں وہ دریا تھا جو تری جانب
راستہ موڑ کر چلا آیا
اب کہاں اپنے خواب رکھے گا
آنکھیں جو پھوڑ کر چلا آیا
جب نہ کوئی ملا تو پھر فاخر
خود کو ہی جوڑ کر چلا آیا

کھو تو دیا ہے پر اسے ہارا نہیں ہوا
نقصان ہو گیا ہے خسارا نہیں ہوا
ہم نے تجھے تراشا ہے ایسے کہ سب کہیں
یہ چاند آسماں سے اُتارا نہیں ہوا
شہرت اسے جو دی ہے تو اب یہ کھلا ہے بھید
وہ سب کا ہو گیا ہے ہمارا نہیں ہوا
وہ بھی نبھا سکا نہ مرے سنگ ٹھیک سے
میرا بھی اس کے ساتھ گزارا نہیں ہوا
سو خواب تھک گئے ہیں نگاہوں کی جھیل میں
تعبیر کا پر ایک اشارا نہیں ہوا
دیکھا ہے اس کو جب سے تو سوچا ہے بارہا
دریا کبھی ست کے کنارا نہیں ہوا

آنکھوں میں یوں تو اُترے ہیں فاخر بہت سے لوگ
دل پر مگر کسی کا اجارا نہیں ہوا

درد بھی بے پناہ کر ڈالا
اس نے مجھ کو تباہ کر ڈالا
تیری مرضی تو جس طرح رکھے
میں نے تجھ سے نباہ کر ڈالا
ہم عذابوں میں کھو گئے ہیں بہت
ہم نے کیسا گناہ کر ڈالا
اتنا آگے نکل گئے خود سے
منزلوں کو بھی راہ کر ڈالا
جسم جلنے لگا تو پھر ہم نے
روح کو بھی سیاہ کر ڈالا
دل پہ اب کوئی اختیار نہیں
دل تری بارگاہ کر ڈالا

بہت دن سے اکیلا ہوں چلے آؤ
اُداسی سے بہلتا ہوں چلے آؤ
مجھے معلوم ہے جاناں تمہارے بعد
میں کیسے سانس لیتا ہوں چلے آؤ
مجھے اکثر غم ہجراں رلاتا ہے
میں تنہائی سے ڈرتا ہوں چلے آؤ
تمہارے واسطے خود کو بدل دوں گا
میں جیسا ہوں تمہارا ہوں چلے آؤ

مری آنکھوں میں آنسو جم گئے اب کے
لب دریا بھی پیاسا ہوں چلے آؤ
چلے آؤ کہ آنکھیں بجھتی جاتی ہیں
تمہاری راہ تکتا ہوں چلے آؤ
چراغ آخر شب کی طرح فاخر
ہوا سے لڑتا رہتا ہوں چلے آؤ

چپ کی تہہ جم چکی ہے ہونٹوں پر
لفظ مفہوم کھوتے جاتے ہیں
خواہشوں پر خراش کی رت ہے
خواب آنکھوں میں مرتے جاتے ہیں
کون ڈھونڈے نشان منزل کا
اب تو رستے بھی خاک اُڑاتے ہیں
اب تو سانسوں کی آہٹوں سے بھی
شہر کے لوگ خوف کھاتے ہیں
اب تو وہ بھی نظر نہیں آتا
سب جسے دیکھنے کو آتے ہیں
اب تو یوں ہے کہ ہم تری خاطر
دل بساتے ہیں دل دکھاتے ہیں
اب تو یوں ہے کہ ہم تجھے کھو کر
صرف سانسوں کا بوجھ اُٹھاتے ہیں

ادبی خبریں/تقریبات

افتخار شوکت/آغا تنویر

ضمیر طالب اور ارشد نذیر ساحل کے اعزاز میں محفل مشاعرہ وتقریب ایوارڈ

اعتراف انٹرنیشنل ایک معروف ادبی تنظیم ہے جس کے روح رواں معروف شاعر حسن عباسی ہیں۔ گزشتہ کچھ عرصہ میں اس تنظیم نے یادگار تقاریب کا انعقاد کیا۔ ایسی ہی ایک تقریب مشاعرہ یوکے سے آئے ہوئے شاعر ضمیر طالب اور اسپین سے آئے ہوئے شاعر ارشد نذیر ساحل کے اعزاز میں منعقد ہوئی۔ صدارت ملک کے نامور کالم نویس ڈرامہ رائٹر، مزاح نگار اور شاعر عطاء الحق قاسمی نے کی۔ مہمانانِ خصوصی ضمیر طالب (یوکے) اور ارشد نذیر ساحل (اسپین) تھے۔ مہمانانِ اعزاز قمر رضا شہزاد (کبیر والا) اور شاہین عباس (شیخوپورہ) تھے۔ اس تقریب میں شعراء و حاضرین کی تعداد نے شرکت کی۔ اس خوبصورت تقریب کا آغاز تلاوتِ کلام پاک سے ہوا۔ تلاوت کی سعادت ندیم اظہر ساگر نے حاصل کی۔ نعت پڑھنے کی سعادت معروف نعت گو شاعر عبدالمجید چٹھہ نے حاصل کی۔ جن شعرائے کرام نے کلام پیش کیا اُن میں عطاء الحق قاسمی، ضمیر طالب، ارشد نذیر ساحل، قمر رضا شہزاد، شاہین عباس، فرحت زاہد، زاہد سعید، ڈاکٹر ضیاء الحسن، حمید شاہین بانو، کنور امتیاز احمد، حسنین سحر، اسد جعفری، رُخسانہ نور، منور سلطانہ، شفیق احمد خاں، عزیر احمد، قیوم اشعر (ساہیوال)، سائل رضا (بھلوال)، رحمٰن فارس، روبینہ راجپوت، قندیل، فاطمہ احمد، عمران مشتاق مانی، سرفراز انور، عفت علوی، سمندر منصوری، احمد خیال، صوفیہ بیدار، حکیم سلیم اختر، زبیدہ حیدر زیبی، ثروبیہ بھٹی، محمد ندیم، اظہر ساگر، سلیم گورمانی، حسن بانو، وسیم عباس، علی کامران نقمی اور محمد اقبال پیام شجاع آبادی کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ معروف سنگر عدیل برکی نے ترنم سے کلام سنا کر خوب داد حاصل کی۔ تقریب میں اعتراف انٹرنیشنل کی طرف سے ضمیر طالب (یو-کے) کو مرزا اسد اللہ خاں غالب ایوارڈ ۲۰۱۳ء اور ارشد نذیر ساحل کو ''میر تقی میر ایوارڈ ۲۰۱۳ء بدست عطاء الحق قاسمی دیے گئے۔ یہ ایوارڈ بیرون ملک مقیم شعراء کے اعتراف فن پر دیے جاتے ہیں۔ تقریب کے آخر میں معروف مزاح نگار حافظ مظفر محسن نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا اور تقریب سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ریفریشمنٹ کے بعد یہ خوبصورت تقریب اختتام پذیر ہوئی۔

''آنچ'' اور ''اعتراف انٹرنیشنل'' کے زیر اہتمام ''مجھے خطبہ نہیں آتا'' کی تقریب پذیرائی

''آنچ'' اور ''اعتراف'' کے زیر اہتمام کوئٹہ میں مقیم معروف شاعرہ جہاں آراء تبسم کے تیسرے شعری مجموعے ''مجھے خطبہ نہیں آتا'' کی تقریب پذیرائی الحمراء ادبی بیٹھک میں منعقد ہوئی۔ صدارت معروف دانشور اور ادیب ڈاکٹر مہدی حسن نے کی مہمانانِ خصوصی مسعود اشعر اور وجاہت مسعود تھے۔ جبکہ مہمانِ اعزاز صوفیہ بیدار تھیں۔ تقریب میں حاضرین کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔ نظامت کے فرائض معروف شاعر اور آنچ کے سرپرست حسن جاوید نے ادا کیے۔ کتاب اور صاحبہ کتاب کے حوالے سے حسن عباسی، راجہ ذوالقرنین، حسین مجروح، صوفیہ بیدار، وجاہت مسعود، مسعود اشعر اور صاحب صدر نے سیر حاصل گفتگو کی اور شاعرہ کی نظموں کو خاص طور پر سراہا۔ مسعود اشعر نے اپنے اظہار خیال میں فرمایا کہ مجھے افسوس ہے کہ اتنی خوبصورت شاعری پہلے میری نظر سے کیوں نہیں گزری۔ صوفیہ بیدار اور حسین مجروح نے بھی اس شعری مجموعے کو اہم قرار دیا۔ نوجوان شاعر شبیر حسن نے شاعرہ سے متعلق انور مسعود کی نظم پڑھ کر سنائی۔ شاعرہ جہاں آراء تبسم نے فرداً فرداً میزبانوں اور مہمانوں کا شکریہ ادا کیا اور اپنی غزلیں اور نظمیں سنا کر بھرپور داد سمیٹی۔ تقریب میں مہمانوں کو یادگاری سوئینر بھی پیش کیے گئے۔ معروف شاعر ناز اوکاڑوی نے جہاں آراء تبسم کو اعتراف انٹرنیشنل کی طرف سے پھولوں کا دستہ پیش کیا۔

اعتراف انٹرنیشنل کے زیر اہتمام جاوید قاسم کے دوسرے شعری مجموعے کی تقریب پذیرائی

اعتراف انٹرنیشنل کے زیر اہتمام معروف شاعر جاوید قاسم کے دوسرے شعری مجموعے ''کوئی چشمہ نکل آئے'' کی تقریب پذیرائی الحمراء ادبی بیٹھک لاہور میں منعقد ہوئی۔ صدارت معروف شاعر اور ادیب خورشید رضوی نے کی۔ مہمانانِ خصوصی ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا اور ڈاکٹر طارق عزیز تھے۔ مہمانانِ اعزاز غلام حسین ساجد اور صوفیہ بیدار تھیں۔ کتاب اور صاحب کتاب کے حوالے سے صاحب صدر اور مہمانوں کے علاوہ عابد حسین عابد، عابد بخاری، خالد نقاش، حسن عباسی، ڈاکٹر عالم خان نے اظہار خیال کیا۔ چند سنگرز نے جاوید قاسم کا کلام ترنم سے بھی پیش کیا۔ اس تقریب میں شاعروں، ادیبوں اور مختلف طبقہ فکر سے تعلق رکھنے والے افراد کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔ تمام مضامین نگاروں نے جاوید قاسم کی شاعری کو سراہا

اور اُسے نوجوان نسل کا اہم شاعر قرار دیا۔ جاوید قاسم نے اپنا منتخب کلام پیش کر کے بھرپور داد سمیٹی۔ جاوید قاسم کو مختلف تنظیموں کی طرف سے تحائف اور پھول بھی پیش کیے گئے۔ ہر حوالے سے یہ تقریب ایک یادگار اور بھرپور تقریب تھی۔

غضنفر ادب اکیڈمی خانیوال کے زیر اہتمام بہاریہ غزلیہ مشاعرہ

گورنمنٹ سیکنڈری سکول 2-B تلمبہ میں غضنفر ادب اکیڈمی خانیوال (برانچ تلمبہ) کے زیر اہتمام بہاریہ غزلیہ مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت سید طاہر واسطی نے کی۔ مہمانانِ خصوصی جناب عباس عدیم قریشی اور فیصل ہاشمی تھے۔ جبکہ ندا فاطمہ، پروفیسر ناصر عباس اطہر اور مظہر بخاری مہمانانِ اعزاز تھے۔ مشاعرے کی میزبانی اور نقابت عمر شاہد تگہ نے کی۔ پنجاب کے مختلف شہروں سے تشریف لائے ہوئے شعراء کرام میں ندیم رضا فاروق، پروفیسر مرزا حفیظ اوج، سہیل انجم شہزاد، ظفر اقبال جن، انور علی انور، مصطفیٰ انور، حسنین شہزاد، راحیل فاروق، سلیم رضا سمرا، اظہر عاشق، افتخار سانول، عدنان آصف، رفیع اسد، قیصر جعفری، علی سجاد کاظم، مجاہد علی یاسر، محسن رضا دانش، یامین غوری، عارش خان، حماس احمد یاسر، مظہر طراز، ایوب حواری اور دیگر شعراء نے شرکت کی۔ حاضرین کی کثیر تعداد نے اس مشاعرے میں شرکت کی اور اپنی داد سے مشاعرہ گرما دیا۔ مشاعرہ کے صدارتی بیان میں سید طاہر واسطی صاحب نے حضرت غضنفر خان روہتگی کی ادبی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کیا اور عباس عدیم قریشی کی سرپرستی میں غضنفر ادب اکیڈمی خانیوال کی خدمات وادبی سرگرمیوں کو خوب سراہا۔ مشاعرہ کے اختتام پر پروفیسر مرزا حفیظ اوج کے مرحوم والد گرامی کے ایصالِ ثواب کے لیے فاتحہ خوانی اور دعائے خیر کی گئی۔

حسن عباسی کے شعری مجموعوں کی تقریب پذیرائی

فعال ادبی تنظیم ''بزمِ فروغِ ادب ساہیوال'' کے زیر اہتمام ملک کے معروف شاعر جناب حسن عباسی کے شعری مجموعوں ہم نے بھی محبت کی ہے، ایک محبت کافی ہے اور اک شام تمہارے جیسی ہو کی تقریب پذیرائی و محفل مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا۔ نشست اول تقریب پذیرائی پر مشتمل تھی جس کی صدارت سیرت ایوارڈ یافتہ شاعر پروفیسر سید ریاض حسین زیدی نے کی۔ جبکہ مہمانانِ خصوصی ممتاز شاعر نجیب احمد اور صدارتی ایوارڈ یافتہ بین الاقوامی گلوکار اور شاعر عدیل برکی تھے۔ مہمانانِ اعزاز میں معروف شاعر و ادیب باقی احمد پوری اور مزاح نگار، کالم نویس حافظ مظفر محسن شامل تھے۔

تقریب کا باقاعدہ آغاز تلاوتِ قرآن حکیم سے ہوا جس کی سعادت قاری بشیر علی نے حاصل کی۔ جبکہ بارگاہِ خیر الانام میں گلہائے عقیدت بین الاقوامی شہرت یافتہ نعت خواں معروف نوجوان شاعر و دانشور اور پروڈیوسر پی ٹی وی کرنٹ افیئرز علی رضا نے پیش کیے۔ نشست اوّل کی نظامت کے فرائض شہنشاہِ نقابت پروفیسر ارجمند احمد قریشی نے ادا کیے۔

نوجوان نسل کے نمائندہ اور جدید لہجے کے شاعر حسن عباسی کے فن و شخصیت پر اپنے مقالہ جات اور مضامین پیش کرنے والوں میں صدر محفل جناب پروفیسر سید ریاض حسین زیدی، جناب نجیب احمد، جناب باقی احمد پوری، جناب مظفر محسن، جناب ندیم عباس اشرف، جناب علی رضا، جناب اکرم ناصر، جناب مسعود اوکاڑوی اور جناب عدیل برکی کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ جبکہ معروف گلوکار عدیل برکی نے حسن عباسی کی ایک غزل ترنم کے ساتھ پیش کر کے حاضرین کی طرف سے خوب داد پائی۔

حسن عباسی کو منظوم خراجِ عقیدت پیش کرنے والوں میں نوجوان شاعر حسرت بلال اور واصف سجاد شامل ہیں۔ نشست اوّل کے آخر میں صاحبِ شام شاعر جناب حسن عباسی نے اپنا کلام پیش کر کے سامعین کی طرف سے خوب داد وصول کی اور اپنی گفتگو میں حسن عباسی نے صدر بزمِ فروغِ ادب ساہیوال علی رضا کا خاص طور پر شکریہ ادا کیا اور کہا کہ ان کے بیس سالہ شعری دور میں یہ پہلی تقریب پذیرائی ہے جسے وہ مدتوں یاد رکھیں گے۔

اس خوبصورت تقریب کا دوسرا دور کل پنجاب محفل مشاعرہ پر مشتمل تھا۔ ملک کے معروف شاعر نجیب احمد نے محفل مشاعرہ کی صدارت فرمائی جبکہ مہمانانِ خصوصی منفرد لہجے کے شاعر باقی احمد پوری اور پنجابی شاعری کی پہچان طالب جتوئی تھے۔ مہمانانِ اعزاز میں ممتاز گلوکار اور شاعر عدیل برکی، جدید لہجے کے شاعر حسن عباسی، معروف توانا شاعر مسعود اوکاڑوی اور دیپالپور تشریف لائے ہوئے سرور جاوی شامل تھے۔

محفل مشاعرہ کی نظامت کے فرائض معروف نعت خواں، شاعر، ادیب اور پروڈیوسر پی ٹی وی جناب علی رضا نے نہایت خوبصورت اور دلنشین انداز میں ادا کیے۔ محفل مشاعرہ میں پنجاب بھر کے مختلف شعرائے کرام نے اپنا خوبصورت کلام پیش کیا۔

جن شعرائے کرام نے اپنا کلام پیش کیا ان میں جناب نجیب احمد، باقی احمد پوری، طالب جتوئی، حسن عباسی، عدیل برکی، علی رضا، مسعود اوکاڑوی، سرور جاوی، پروفیسر ریاض حسین زیدی، بابا خوشی محمد نثار، فدا بخاری، مظہر بخاری، واصف سجاد، غلام مرتضیٰ ساجد، حسرت بلال، اسلم سحاب، فاروق اظہر، قاری شبیر علی، انجم جلیل، افتخار ساجد، وصی عباس، راجہ سجاد، غلام عباس، شمشیر حسین زاہد، احمد دین قادری، حکیم شاہنواز انجم و دیگر شامل ہیں۔

متفرق شاعری

کوئی خواب برائے خواب
آئے اور لے جائے خواب
اُبھی اُبھی پلکوں پہ
پاگل کون سجائے خواب
میں ہوں تنہائی ہے اور
بس دو چار پرائے خواب
دیوانوں کا حال سنو
آنکھیں دے کر لائے خواب
تعبیروں کی وادی میں
آ جا پاس بلائے خواب
سالا پاگل ہوتا دل
آئے روز دکھائے خواب

سجاد احمد سجاد/وہاڑی

ہوائے شوق میں دیوانہ وار جلنے لگے
جو ایک بار جلے بار بار جلنے لگے
یہ کس نے چھیڑا محبت کا گیت وادی میں
پگھلنے برف لگی اور چنار جلنے لگے
سواری حسن کی گزری جو اس کی گلیوں سے
دیار عشق کے لیل و نہار جلنے لگے
کوئی بھی عشق کی یلغار سے نہیں بچتا
حصار کھینچ کے دیکھو حصار جلنے لگے
عجیب حلقہ احباب میں گھرا ہوا ہوں
بس ایک شعر سنایا تھا یار جلنے لگے
تپش کچھ ایسی تھی اس شوخ کے سراپے میں
سو اس کے وصل میں ہم افتخار جلنے لگے

افتخار حیدر

دل کی بات بتا کر دل کا درد بڑھانا ٹھیک نہیں
پھر دل کو اپنے دل کا حال سنانا ٹھیک نہیں
بھول گئے ہیں لوگ جو گزری باتوں کو سب یادوں کو
پھر اُن کو ان باتوں کا احساس دلانا ٹھیک نہیں
تو کیا جانے اس محفل میں ہم کیا سوچ کے بیٹھے ہیں
یاں چپ رہنا مشکل ہے کچھ بھی بتلانا ٹھیک نہیں
یارو کوئی جا کر اُن کو اتنی بات بتا آؤ
یادوں کے بند دروازوں پہ ضرب لگانا ٹھیک نہیں
دل میں چھپے جذبات زباں پر آتے ہیں تو آنے دو
ان جذبات میں چپکے چپکے جلتے جانا ٹھیک نہیں
سحر جو دل دے بیٹھے ہیں وہ توڑیں یا برباد کریں
دل دے کر دل دینے پر ایسے پچھتانا ٹھیک نہیں

سحر سرفراز بودلہ/اوکاڑا

گم سم ہے چاند ساتھ ستارے اُداس ہیں
ہر سو تیرے بغیر نظارے اُداس ہیں
غنچے خفا خفا ہیں تجسس میں ہیں گلاب
اک میں نہیں حضور یہ سارے اُداس ہیں
چپ رہنا کچھ نہ کہنا مگر پھر بھی ایک بار
آ جا کے رتجگوں کے یہ مارے اُداس ہیں
آنچل ہٹا کے موج تبسم ہو جلوہ گر
ورنہ یہ رنگ و نور کے دھارے اُداس ہیں
جلتے رہے دیے بھی سحر میرے ساتھ ساتھ
کیونکہ ہوا کے خوف سے تارے اُداس ہیں

سحر سرفراز بودلہ/اوکاڑہ

اِک شام

روز اِک شام
خود میں گم ہوتے دیکھتی ہوں
جانے کہاں کھوگئی ہوں
کوئی ہم سفر بھی تو ہو مگر اُسے کھوجتی پھرتی ہوں
جانے کون تھا کہاں ہے اب
اس دل میں جو بستا تھا
اُس کو ڈھونڈتی ہوں......

اِرسہ موِن/شاہ کوٹ

عشق سے عشق تک

دور دور تک صحرا کڑی دھوپ بس رہ گئی
یہ کیسا سفر ملا ہمیں کوئی راستہ نہ منزل کوئی
زندگی کا نہ ساتھی ملا جان کی بازی بھی ہار دی
اپنوں کو بھی گنوا گئے مٹی کے تھے بنے ہوئے
مٹی میں ہی سما گئے ملا یہ کیسا ہم کو سفر
عشق سے عشق تک

نایاب سحر/لالہ موسیٰ

زمانے کو دکھانا چاہتا تھا
میں خود کو پھر بنانا چاہتا تھا
میں دریا کو بنا بیٹھا تھا دشمن
مگر گھر بھی بچانا چاہتا تھا
اُسی کے سپنے آنکھیں دیکھتی تھیں
جسے دل بھول جانا چاہتا تھا
بے وجہ روٹھ کر ہی چل دیا وہ
وہ کب سے ہی بہانہ چاہتا تھا
وہیں دل کھینچ کر لے جاتا ارشد
جہاں سے لوٹ آنا چاہتا تھا

ارشد نذیر کاٹھیا/میاں چنوں

راہ منزل چلے چلی منزل
ہے ارادوں میں پختگی منزل
آؤ سب ہم سفر بنو میرے
ڈھونڈتے ہیں ہری بھری منزل
راستہ پر خطر بہت لیکن
ہر نئے موڑ پر نئی منزل
خلد سے ہم زمیں تلک آئے
منزلوں میں جو ہے بڑی منزل
ہر نشاں بے نشاں نہیں ہوتا
دل کی راہوں پہ مل گئی منزل
ابتدائے سفر مرا مدفن
کون کہتا ہے آخری منزل
ندیم اظہر ساگر/ دوبئی

شب گزاری کہ رتجگے میں تھا
یاد کے ایک سلسلے میں تھا
کھو گیا پھر وجود بھی اپنا
میں کسی اور آئینے میں تھا
چاند بھی ہاتھ میں اتر آیا
یہ ہنر اس کے معجزے میں تھا
شہر یاراں میں اجنبی رہنا
میری قسمت کے حادثے میں تھا
ہم نے دیکھا کہیں نہیں ساگر
جو سکوں شب کو جھونپڑے میں تھا
ندیم اظہر ساگر/ دوبئی

Sorry

کسی کو جان کر جب جان سے یوں مار دیتا ہو
تو یوں ہی مار دیتے ہیں
اسے لفظوں کا میٹھا زہر دے کر جان لیتے ہیں
کہ اکثر خنجروں کے وار سے مارا ہوا وہ شخص
کبھی! بچ بھی جاتا ہے
مگر لفظوں کا میٹھا زہر پی کر
بچ جانے کا کوئی امکان باقی ہی نہیں رہتا!
کوئی نقصان باقی ہی نہیں رہتا
کسی کو جان سے جب مار دینا ہو
تو لفظوں کا یہ میٹھا زہر اکثر کام دیتا ہے
یہ چپکے سے کسی کی جان لیتا ہے
کہ اکثر پکڑے جانے پر
ضمانت صرف چھوٹے سے فرنگی لفظ
Sorry سے بھی ممکن ہے
خدایا! دیکھ لے
انسان کا دستور کیسا ہے
سعد/ لاہور

پیار ہی پیار زندگی ہے مری
اس لیے تم سے دوستی ہے مری
اب نہیں ہے کوئی بھی تیرے بعد
تو محبت ہی آخری ہے مری
بول اے خوش جمال بولے جا
تیرا اظہار تازگی ہے مری
جان دے دوں تمہارے کہنے پر
جان دے دوں یہی خوشی ہے مری
وہ مرا ہو نہیں سکا خاور
بس یہی ایک بے بسی ہے مری
خاور نعیم بٹ/ لاہور

ہجر کے مارے جاگ رہے ہیں
چاند ستارے جاگ رہے ہیں
کچھ ہیں میٹھی نیند میں
کچھ بیچارے جاگ رہے ہیں
کیسے سوئے وہ ماں جس کے
راج دلارے جاگ رہے ہیں
رات کا پچھلا پہر ہے لیکن
ہم دکھیارے جاگ رہے ہیں
درد خواب نگر میں گم صم
اور کنارے جاگ رہے ہیں
تجھ کو پا کر جان لیا ہے
بخت ہمارے جاگ رہے ہیں
جابر نظامی

حیران نہ ہونا

کھوئی ہوئی سی مری آنکھوں میں
چاہت کے خون سے رنگی ہوئی
یہ ویرانی تحفہ ہے کسی کا
گواہ ہے آج بھی یہ چاند
حیران نہ ہونا
خود کو گمنام کیے دور ہوں تیری دنیا سے
کہا بھی تو تو نے تھا چلا جاؤں وہاں
کہ میرا سایہ بھی دکھائی نہ دے
میں نبھا رہا ہوں وعدے
گواہ ہے آج بھی یہ چاند
حیران نہ ہونا
یہ سنجیدگی، یہ تنہائی
یہ پلکوں پہ سجا ہوا رتجگا
تحفہ ہے کسی کا
گواہ ہے آج بھی یہ چاند
حیران نہ ہونا
ہاں مجھے شکوہ ہے بہار کے موسم سے
جب پھول کھلتے ہیں
پر میں تو ٹھہر گیا ہوں
خزاں کے بڑھاپے میں
یہ جوانی کی کونپلیں
تڑپ کا احساس پیدا کرتی ہیں
پر میں بدلا نہیں
اس دل نے کسی کو چاہا نہیں
گواہ ہے آج بھی یہ چاند
حیران نہ ہونا
شہزاد ملک/ خیر پور ٹامیوالی

تبصرۂ کتب
ناز بوکاڑوی

اِذن
واجد امیر — صفحات: ۱۲۰ — قیمت: ۱۸۰

واجد امیر جی ایک کہنہ مشق شاعر ہونے کے ساتھ چوپال ادب میں بحیثیت نائب صدر بھی ذمہ داریاں نبھا رہے ہیں۔ جیسا کہ نعت گوئی ہمیں حضرت نعمان بن ثابت ؓ سے ثابت ہوتی ہے۔ نعت کے لغوی معنی دیکھے جائیں تو صرف ''حضور اکرم ﷺ'' کی مدح، تعریف و توصیف ملتے ہیں۔ عرب سے سفر کرتی ہوئی نعت خطہ فارس میں داخل ہوتی ہے تو وہاں بھی حضور اکرم کی شان کریمی میں ایسے ایسے جوہر پارے تخلیق ہوئے کہ عاشقانِ رسول پڑھ کر عش عش کر اُٹھے۔ یہ اسی شاعری کا فیض تھا کہ بعد میں صحابہ کرام کی صف میں شامل ہونے والا حضرت سلمان فارسی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق میں مبتلا ہو کر خلیج فارس کو پار کرتے ہوئے ریگستان عرب میں آ بستے ہیں۔ اس وقت کی شاعری میں شعراء حضرات نے حضور پر نور حضرت محمد ﷺ کی تعریف کچھ اس انداز میں کی کہ لوگ حضور عالی مرتبت ﷺ مرتب کو دیکھنے کا اشتیاق کرنے لگے۔ اب تک سینکڑوں نہیں ہزاروں لاکھوں شاعر حضرات نعتیہ اشعار کہہ اور پڑھ چکے ہیں۔ پڑھ رہے ہیں اور پڑھتے رہیں گے۔ ان گنت مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ ایک دور برصغیر میں بھی آتا ہے جب محمد بن قاسم کے دیبل (موجودہ کراچی) پر مسلمان عورتوں کو ظلم و ستم سے بچانے کے لیے آتا ہے تو فوج کے ساتھ ہر طبقہ کا فرد بھی اس خطہ میں داخل ہوا۔ جن میں مبلغ اسلام بھی تو شاعر بھی تھے۔ نعت کی صنف بھی اس طرح برصغیر میں متعارف ہوئی تو ساتھ ساتھ مقامی شعراء نے بھی اپنی عقیدت کا اظہار کرنا شروع کیا۔ آنے والے وقتوں میں نعت گوئی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمیں اپنی زبان میں حضور اکرم ﷺ کی حالات زندگی جاننے میں مدد ملی۔ وہاں ان کی شانِ اقدس میں بھی لکھنے، کہنے اور سننے کا موقعہ ملا۔ یوں تو برصغیر میں بھی نعت کے حوالے سے بہت کام ہوا اور ہو رہا ہے۔ ہر کوئی دامے درمے سخنے حصہ لے رہا ہے۔ پھر نعت اس لحاظ سے بھی خوش نصیب ہے کہ ہر شاعر اپنی شاعری کی ابتدا جہاں حمد و ثناء سے کرتا ہے تو نعت کو بھی برابر درجہ دیتا ہے۔ چیدا چیدا مجموعہ میں حمد نہیں مگر نعت ضرور ہوتی ہے۔ بعض حضرات نے تو اپنی شاعری صرف نعت ہی کے نام منسوب کر رکھی ہے۔ بلاشبہ نعت کے حوالے سے بہت سے معتبر نام ملتے ہیں۔ اسی صف میں ہمیں واجد امیر صاحب کھڑے نظر آتے ہیں۔ اس میں مبالغہ نہیں کہ واجد امیر نے نعت میں بھی وہی انفرادیت قائم رکھی ہے جو ان کی عام شاعری میں نظر آتی ہے۔ جہاں انہوں نے ذات پاک ﷺ کی تعریف و توصیف کا خیال رکھا ہے تو وہاں فکری و فنی دونوں حوالوں سے اپنی نعت کو انفرادیت کا حامل بنایا ہے۔ واجد امیر نے نعت رسول کریم ﷺ کے اظہار کے لیے بعض ایسی مشکل زمینوں کا انتخاب بھی کیا ہے جہاں کبھی کبھار قافیہ شکار شاعر آپ شکار قافیہ ہو جاتا ہے۔ واجد نے بڑی مہارت سے ان زمینوں کا استعمال کیا ہے۔ بحیثیت مجموعی واجد امیر کی نعت آج کی تہذیبی و تمدنی زندگی کو درپیش مسائل سے اُبھرنے والی نعت ہے۔ نعت کا یہ شعر دیکھیں:

گر سراپا شہ والا کا بیان کرنا ہو — پاس مشکوٰۃ رکھو، سامنے قران رکھو

سبحان اللہ۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

عشق سیّد ہے
شاعر: نوید حیدر ہاشمی — صفحات: ۲۷۶ — قیمت: -/۳۰۰ — ناشر: نستعلیق مطبوعات

سیّد نوید حیدر ہاشمی صاحب تخلص نوید ہاشمی جن کا تعلق ہمارے پیارے ملک پاکستان کے ایک ایسے صوبہ سے ہے جو نہ صرف معدنی وسائل سے مالا مال ہے بلکہ اپنی نباتات اور جمالیات کا بھی ثانی نہیں رکھتا۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا ان خصوصیات کے ساتھ ساتھ مردم خیز بھی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اہم شخصیات جنم لیتی رہی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ دوسری جگہ سے یہاں آ کر بسرام کرنے والے لوگ بھی اسی بود و باش میں رہتے ہوئے نامور کہلائے۔ انہی لوگوں میں سے ایک سیّد گھرانے کے چشم و چراغ ہیں جناب نوید ہاشمی جو صوبہ پنجاب کے ایک زرخیز گاؤں کسووال (ضلع میاں چنوں) سے ہجرت کر کے صوبہ بلوچستان جا بسے۔ جب بھی لفظ ہجرت آئے گا تو آنحضرت صلعم کا ذکر اوّلین ہوگا۔ آپ نے بھی مکہ سے مدینہ ہجرت کر کے دُنیا میں وہ مقام پایا ہی نہیں بلکہ مدینہ کو بھی منور کر دیا۔ گو کہ نوید ہاشمی صاحب بھی ہاشمی گھرانے کی لڑی میں سے ایک پھول ہیں۔ آپ نے بھی ہجرت کر کے اپنا نام بھی روشن کیا تو کوئٹہ کو بھی ایک علاحدہ پہچان دی۔ آج ادبی، سماجی خدمات کی بدولت کوئٹہ جانا پہچانا جاتا ہے۔

حال ہی میں ''ادارہ نستعلیق مطبوعات'' نے ان کا مجموعہ کلام ''عشق سید ہے'' چھاپا ہے۔ جس کا نا صرف سرورق دل موہ لینے والا، دلکش انداز لیے ہوئے ہے تو شاعری تو اتنی خوبصورت جی چاہتا ہے پوری کتاب ہی لکھ دوں لیکن پرچے کے مروّجہ اصول کے پابند ہونے کے ناتے قاصر ہوں۔ میں اتنا ضرور کہوں گا

بعض مجموعہ ہائے کلام کے سرورق اور نام تو جاذب نظر ہوتے ہیں لیکن کلام میں وہ چاشنی نہیں ملتی یا یہ کہہ لیں کہ قاری تشنہ لبی کا شکار نظر آتا ہے لیکن نوید ہاشمی صاحب کے ہاں ایسا نہیں۔ مجموعہ کا نام اگر انوکھا ہے تو کلام میں بھی انوکھا پن ہے۔ جو قاری کو تشنگی کا احساس دلائے بغیر سیر حاصل تسکین و راحت بھی دے گا۔ مجموعہ میں عشق سید پر ایک مکمل اور مدلل غزل موجود ہے۔ اس سے ہٹ کر ایک سے بڑھ کر ایک غزل ہے۔ نظر تھکتی نہیں دل بھرتا نہیں۔ یہی کسی مجموعہ کی خوبی ہوتی ہے اور پھر نوید صاحب کی انتھک محنت اس بات کا ثبوت ہے۔ غزل کی آبیاری میں خون کی ضرورت ہوتی ہے۔ سید صاحب نے خون جگر سے سینچا ہے تو خون سے ہی آبیاری کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ہر غزل میں ان کی جانفشانی کا جہاں پسینہ موتی بن کے چمکتا ہے تو وہاں خون جگر کی سرخی بھی نمایاں ہے۔ اس سے قبل نوید ہاشمی کے تین شعری مجموعہ ہر خاص و عام میں مقبولیت ہی نہیں داد و تحسین پا چکے ہیں۔ مذہبی شاعری کے علاوہ کالم نگاری میں بھی یکتا مہارت رکھتے ہیں۔ ہمیں اُمید ہے ''عشق سید ہے'' بھی ماضی کی طرح عوام میں مقبول ہوگا۔ ان اشعار پہ ختم کرتا ہوں

پا بہ زنجیر دہکتے ہوئے انگاروں پر — اس قدر رقص کروں آگ سسکنے لگے
تمہاری یادوں کا عرس مجھ میں لگا ہوا ہے — جو آ گئے ہو تو مل کے ڈالیں دھمال مرشد
ہجوم چیخ رہا تھا اُٹھا اُٹھا کے ہاتھ — میں کہہ رہا تھا سردار، فی امان اللہ

تنہائی کا سفر

شاعر: میاں ریاض تصور صفحات: ۱۹۲ قیمت: -/۳۰۰ ناشر: طٰہٰ پبلی کیشنز

شاعری بھی تو شاعر کے تنہائیوں کے سفر کی ساتھی ہی ہوتی ہے۔ یہ تنہائی کا ہی کمال ہے جو شاعر کے فکر کو جلا بخشتی ہے۔ اسی تنہائی کے سفر کے ایک مسافر جناب میاں ریاض تصور بھی ہیں۔ حال ہی میں طٰہٰ پبلی کیشنز کی طرف سے ان کا مجموعہ ''تنہائی کا سفر'' شائع ہوا ہے۔ تنہائی کا سفر غزلوں کا مجموعہ ہے۔ یقیناً قارئین کو پسند آئے گا۔ شاعر کا اعلان بھی ہے وہ اپنی کتاب مفت تقسیم کرتے ہیں۔ عاشقان ادب طٰہٰ پبلی کیشنز سے رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔

یادوں کے جگنو

شاعرہ: نبیلہ رفیق صفحات: ۱۵۲ ناشر: یونیک پبلی کیشنز

محترمہ نبیلہ رفیق دیارِ وطن سے دور اپنی دنیا میں گم اچانک ایک حادثہ نے اُنہیں شاعرہ بنا دیا۔ ان کے کلام میں جا بجا درد چھپا ہوا ملتا ہے۔ بحیثیت صنف نازک حساس طبیعت بھی جا بجا نظر آتی ہے۔ محترمہ فوزیہ مغل کے بقول ''نبیلہ رفیق کا نام شعر و ادب کی دُنیا میں ایک خوبصورت اضافہ ہے۔ اسے انڈیا کے صوبہ پنجاب سے یونیک پبلی کیشنز نے چھاپا ہے۔ واقعی جگنوؤں کی طرح ہی ان کے اشعار چمک رہے ہیں۔

خواب خواب زندگی

شاعرہ: فرزانہ فرحت صفحات: ۱۴۳ ناشر: شریف اکیڈمی، جرمنی

فیروز سنز پرائیویٹ لمیٹڈ نے انگلینڈ میں مقیم شاعرہ محترمہ فرزانہ فرحت کے مجموعہ کلام ''خواب خواب زندگی'' کو شائع کیا ہے۔ محترمہ کا پہلا مجموعہ بھی قارئین سے داد و تحسین پا چکا ہے۔ اس مجموعہ میں بھی شاعری کی تمام اصناف موجود ہیں۔ جس سے شاعری کی تخلیقات کو پرکھنے میں مدد ملتی ہے۔ محترمہ فرزانہ نے بھی اپنے شاعری کے جواہر دکھائے ہیں۔ یقیناً یہ مجموعہ بھی ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔

کبھی آ تو سہی

شاعر: سہیل نیاز صفحات: ۹۶ قیمت: -/۲۰۰ ناشر: ایس میب ٹریڈرز

95 صفحات کا مختصر مجموعہ ''کبھی آ تو سہی'' یہ کہنا بے جا نہ ہوگا موصوف نو وارد ہونے کے ساتھ ساتھ نو آموز بھی ہیں۔ اشعار پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے انہیں آگے بڑھنے کا شوق ہے۔ اگر صحیح راہنمائی مل جائے تو مستقبل کا اچھا شاعر ثابت ہو سکتا ہے۔ جناب سہیل نیاز کی حوصلہ افزائی کے لیے ''کبھی آ تو سہی'' کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ ایس میب ٹریڈرز والوں نے شائع کرنے کا اہتمام کیا ہے۔

خوشبو، خوشبو

شاعر: ڈاکٹر فخر عباس چدھڑ صفحات: ۲۵۰

ڈاکٹر ''فخر عباس چدھڑ'' جی کا مجموعہ جسے ضرو پبلی کیشنز نے اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔ مجموعہ بے شک بہت سادگی سے چھاپا گیا ہے مگر اس میں اردو اور شاعری میں بڑی رنگینی ہے۔ قارئین کو یقیناً پسند آئے گی۔

رُوپ کا کندن

شاعر: منیر انور صفحات: ۱۶۰

جناب منیر انور صاحب کی غزلوں کا مجموعہ ''رُوپ کا کندن'' چھپ کر مارکیٹ میں آ چکا ہے۔ انور صاحب بزنس مین ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے شاعر بھی ہیں۔ جسے پڑھ کر آپ کو بھی بخوبی اندازہ ہوگا۔ بزنس سے وقت نکال کر شاعری کرنا اور وہ بھی بھرپور طریقے سے انور صاحب کا کمال ہے۔ یہ شعر

شعریت سے بھرپور اُن کی شاعری سے دل بستگی ظاہر کرتی ہے۔

میرے بچے اُداس رہتے ہیں کام سے وقت ہی نہیں ملتا

مغل پبلشنگ سے شائع ہونے والا یہ مجموعہ ہر خاص و عام کو پسند آئے گا۔

بیت بازی

تالیف: بشریٰ شیریں صفحات: ۲۶۸ قیمت: ۳۴۹ ناشر: دی رائٹرز

بیت بازی جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ بشریٰ شیریں کا انتخاب ان طلباء و طالبات کے لیے ترتیب دیا گیا ہے۔ جو سکول اور کالج کی سطح پر شاعری کے مقابلوں میں شریک ہوتے ہیں۔ اس انتخاب میں نامور شعرائے کرام کے انتہائی مقبول اشعار شامل کیے گئے ہیں۔ تاکہ قاری اور سامعین اس سے بھرپور استفادہ کر سکیں۔ بیت بازی ''دی رائٹرز'' اے۔ ری بک سینٹر، شاہ کمال روڈ، راداں رحمٰن پورہ لاہور نے شائع کیا ہے۔

دیوانِ ریاض

تحریر: سید محمد ریاض الدین ناشر: کرماں والا بک شاپ

کرماں والا بک شاپ دکان نمبر 2 داتا مارکیٹ سے شائع ہونے والی کتاب دیوانِ ریاض، نعت شریف کے حوالہ سے ایک معتبر نعتیہ دیوان ہے۔ جناب حضرت علامہ سید محمد ریاض الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ کی عقیدت رسول کریم صلعم میں ڈوب کر لکھی ہوئی نعتیں ہیں۔ اہل محبت محمد صلعم کے لیے ایک انمول تحفہ ہے۔ اپنی پسندیدگی کے حوالے سے دوسری بار اشاعت پذیر ہوا۔ یہ پسندیدگی کی ایک مثال ہے۔ اُمید ہے آپ کو بھی پسند آئے گا۔

نانگا پربت کے جھرنوں میں

تحریر: ڈاکٹر محمد اقبال

ڈاکٹر محمد اقبال ہما کا سفر نامہ نانگا پربت کے جھرنوں میں جیسا کہ نانگا پربت کا ذہن میں خیال آتے ہی وہاں کے دشوار گزار راستے اور دیگر مشکلات ذہن میں آتی ہیں۔ یقیناً ''ڈاکٹر محمد اقبال ہما'' نے کٹھن راہوں کو کٹھن حالات میں ہی سر کیا ہے۔ نانگا پربت پڑھ کر یوں لگتا ہے جیسے ہم بہ نفس نفیس وہاں موجود ہیں۔ ان کی اس کاوش کو سراہتے ہیں۔ ''سجاد پبلی کیشنز'' مچھلی منڈی اُردو بازار لاہور نے اسے مکمل اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔

سانجھے سفنے

ملک ارشاد

ہمارے تمہارے ہم سب کے سانجھے خواب، پنجابی میں سفنے ہوتے ہیں۔ ایسے ہی سانجھے سفنے ملک ارشاد صاحب نے بھی دیکھے ہیں اور ان کو ہم تک پہنچانے میں پنجابی مرکز 7 اے سٹریٹ 6 کو چا محمدی، سلطان پورا لاہور نے تعاون کیا ہے۔ اس مجموعہ میں غزلیں، نظمیں پوری رعنائی کے ساتھ جلوہ نما ہیں۔

کالی رات میں جگنو

ابرار احمد

جناب ابرار احمد ادبی حلقہ میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ اس سے پیشتر بیس مجموعے مارکیٹ میں دادِ تحسین پا چکے ہیں۔ حالیہ مجموعہ ''کالی رات میں جگنو'' 1980 اشعار پر مشتمل فردیا مجموعہ ہے۔ چار چاند پبلشرز۔ ٹاؤن شپ لاہور نے اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔

کائنات مٹھی میں

ایم۔ زیڈ۔ کنول

ایم۔ زیڈ۔ کنول ادبی حلقہ میں اپنی ایک پہچان رکھتی ہیں۔ جہاں آپ اچھی شاعرہ ہیں تو وہاں بہترین مقررہ، مضمون نگار، کھلاڑی اور کمپیئر بھی ہیں۔ اُردو، پنجابی دونوں زبانوں پہ دسترس رکھتی ہیں۔ موجودہ مجموعہ بھی یقیناً دادِ تحسین وصول کرے گا۔ باقر پبلی کیشنز، لاہور نے اسے شائع کرنے کا اہتمام کیا ہے۔

ڈوہنگے پانی

شاعر: نازاو کاڑوی تبصرہ نگار: محمد اقبال پیام شجاع آبادی قیمت: ۱۶۰ صفحات: ۱۴۴ ناشر: اے ٹو زیڈ پبلشرز

''ڈوہنگے پانی'' معروف شاعر نازاو کاڑوی کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ نازاو کاڑوی گزشتہ دو دہائیوں سے شعر و ادب سے وابستہ ہیں۔ ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ شاعر، صحافی اور افسانہ نویس ہیں۔ اُن کی تخلیقات گزشتہ کئی برسوں سے پاکستان کے نمائندہ ادبی جرائد کی زینت بن رہی ہیں۔ زیر نظر شعری مجموعہ ''ڈوہنگے پانی'' اُن کی پنجابی شاعری پر مشتمل ہے۔ ان کے شاعری سے متعلق کنول مشتاق اور زبیر وحید کی آراء شامل ہیں اور انہوں نے نازاو کاڑوی کو جدید شاعری میں منفرد اور معتبر شاعر قرار دیا ہے۔ نازاو کاڑوی نے زندگی کا بہت قریب سے مشاہدہ اور تجربہ کیا ہے اور اس مشاہدہ اور تجربے کو ''ڈوہنگے پانی'' کے روپ میں نذرِ قارئین کر دیا ہے۔ اُن کی شاعری ان کے باطن اور ظاہر کا اظہار ہے۔ وہ سادہ اور آسان زبان میں شعر کہتے ہیں۔ ان کی پنجابی شاعری میں ایک خاص چاشنی ہے جو قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ اس خوبصورت شعری مجموعے کو اے ٹو زیڈ پبلشرز لاہور نے شائع کیا ہے۔

نامہ ہائے احباب

مکرمی حسن عباسی!

سلام مسنون! آج کے دور میں ادب کے لیے آپ کا کردار باعث رشک ہے۔ میں ہمیشہ آپ کی کامیابی کے لیے دعا گو ہوں۔

''ارژنگ'' کے لیے چند تخلیقات ارسال کر رہا ہوں۔ اُمید ہے پسند فرمائیں گے۔

مخلص

فرخ راجا

❁❁❁

ڈیئر حسن!

ایک افسانہ بھیج رہی ہوں رہی ہوں۔ اُمید ہے پسند آئے گا اور ارژنگ میں جگہ پائے گا۔ رسالہ بھیجنے کا بہت شکریہ۔

نیلم احمد بشیر

❁❁❁

حسن عباسی صاحب!

حسب وعدہ ''ارژنگ'' کے لیے ایک غزل اور نظم بھیج رہی ہوں۔ سلامت رہیں مزید کامیابیاں نصیب ہوں۔ والسلام

تسنیم کوثر

❁❁❁

محترم بھائی حسن عباسی! السلام علیکم

آپ کا ارسال کردہ ''ارژنگ'' کا تازہ شمارہ موصول ہو گیا تھا اور ہمیشہ کی طرح مذکورہ رسالہ کا مطالعہ نہایت دلفریب رہا۔ آپ کے حکم کے مطابق اپنی تخلیقات ارسال کر رہا ہوں۔ اُمید ہے پسند آئیں گی اور آپ کے اگلے آنے والے شمارہ میں جگہ پائیں گی۔ آپ کی خیریت کا طالب

افضل خان

❁❁❁

جناب حسن عباسی صاحب!

السلام علیکم سر! کیسے ہیں آپ؟ مجھے خط لکھنے کا کچھ خاص اندازہ نہیں ہے بس دل چاہ رہا ہے ارژنگ اور لکھنے والوں کی کچھ تعریف کروں۔ سب سے پہلے تو ٹائٹل بہت منفرد اور پیارا تھا۔ آپ کی شاعری جیسا۔ پھر یہ کہ ارژنگ بہت سے رسائل سے مختلف منفرد مقام رکھتا ہے۔ سارا کمال پھولوں والے ہاتھوں کا ہے۔ سر عطاء الحق قاسمی پہ خورشید رضوی صاحب کا مضمون بہت خوب تھا اور پروین شاکر جو ہماری فیورٹ شاعرہ ہیں زہبی صاحبہ کا ان پہ اور ان کی شاعری پہ لکھا بہت اعلیٰ تھا۔ انتخاب شاعری بھی۔

پھولوں والے ہاتھ سر حسن کا وعدہ ڈاکٹر صاحبہ کی شاعری ان کی شخصیت کو اتنی خوبصورتی سے بیان کرنے پہ شاباشی۔

لگتا ہے تیری آنکھ ہے میرے وجود میں
رکھتی ہے جو خبر مری اک ایک بات کی

بہت خوب۔ عابد کاظمی صاحب پہ ابرار ندیم صاحب نے بہت اچھا لکھا شاعری پسند آئی۔

عامر صاحب کی غزل واہ......!!

تم سے شکوہ نہ زمانے سے شکایت کی ہے
ہم ہی مجرم ہیں کہ اس دور میں چاہت کی ہے
چاہتیں اور بھی گزری ہیں زمانے میں مگر
جیسے ہم کرتے ہیں کب کس نے محبت کی ہے

شبنم صاحبہ نے بہت خوبصورت الفاظ میں سر عامر پہ لکھا۔ اس دفعہ تمام شاعری انتخاب بہت اچھا تھا۔ خالد شریف صاحب کا انتخاب خوب تھا۔ چند اشعار:

جب اپنے اپنے مقصد یاد آئے
کھلا ہم میں کوئی رشتہ نہیں ہے

اور

ایک بے نام اُداسی کی جھلک چہرے پر
شاید اس شہر سے رُوٹھی ہوئی تم لگتی ہو

متفرق شاعری میں کامی شاہ صاحب کی غزلیں لاجواب تھیں۔ باقی سارا ارژنگ بہت اچھا تھا۔ آخر میں اتنے خلوص سے کتاب بھیجنے کا جواباً بہت سارا شکریہ۔ بہت ساری دُعائیں چاہتیں آپ سے۔ بہت سی دُعاؤں کے ساتھ

ارسہ مون / شاہ کوٹ

❁❁❁

محترم حسن عباسی صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ اُمید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔

گزرتے ماہ ''ارژنگ'' ملا پڑھ کے بہت خوشی ہوئی۔ حال ہی میں میرا پہلا مجموعہ ''میری سانسوں میں تم ہو'' منظر عام پہ آیا ہے اور میں بہت شکرگزار ہوں کہ ''ارژنگ'' میں مجھے جگہ ملی۔ اللہ تعالیٰ ''ارژنگ'' کو ہر ماہ کامیابی سے نوازتا رہے آمین

نایا سحر / لالہ موسیٰ

❁❁❁

(بقیہ: انٹرویو ڈاکٹر انعام الحق جاوید)

ارژنگ: بقول منیر نیازی ادبی ایڈیشن، اخبارات و رسائل پراگندگی پھیلا رہے ہیں ایک ادبی اخبار کے ایڈیٹر کی حیثیت سے آپ کیا کہیں گے؟

ڈاکٹر انعام الحق: منیر نیازی ایک فقرے باز شخص ہیں۔ ترنگ میں آ کر کچھ بھی کہہ سکتے ہیں۔ خود منیر نیازی کو بھی تو پورے ملک میں انہی ادبی ایڈیشنوں نے ہی پھیلایا ہے حالانکہ وہ پراگندگی نہیں ہیں بلکہ سرتاپا حسن اور خوبصورتی ہیں۔ ۷۷-۱۹۷۶ء کے زمانے میں عطاء الحق قاسمی نے نوائے وقت کے اکلوتے ادبی ایڈیشن کے ذریعے منیر نیازی کے چست اور تیکھے انٹرویوز کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا جو آج تک جاری ہے۔ اس لیے ایک ہی سانس میں سب کو لپیٹ لینا موزوں نہیں۔ ادبی اخبار اور ادبی ایڈیشن ادب اور فروغ ادب کے ابلاغ کا ایک موثر بلکہ موثر ترین ذریعہ ہیں تاہم کبھی کبھی کہیں ایسی باتیں بھی چھپ جاتی ہیں جنہیں پڑھ کر گھن آتی ہے اور لکھنے والوں کی شوورانہ ذہنیت کا ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے لیکن یہاں بھی منیر نیازی سے متفق نہیں ہوں کیونکہ ایسے لوگ پراگندگی نہیں بلکہ براہ راست گندگی پھیلا رہے ہیں۔

ارژنگ: آپ بیک وقت استاد نقاد اور شاعر ہیں آپ کے نزدیک آپ کی اصلی پہچان کس حوالے سے ہے؟

ڈاکٹر انعام الحق جاوید: میرا خیال ہے کہ میری اصل پہچان شاعری ہی ہے۔ باقی اضافی شوق ہیں تاہم یہ شوق بھی ادبی نوعیت ہیں جو تخلیقی سفر کو آسان بنانے میں مدد ثابت ہو رہے ہیں۔ مثال کے طور پر ٹی وی کے صبح کے لائیو پروگرام تخن رنگ کی کمپیئرنگ کے باعث ہر ہفتے آٹھ دس کتابیں پڑھنے کو مل جاتی ہیں اور ایک دو ادیبوں سے تفصیلی ملاقات ہو جاتی ہے۔

ارژنگ: ہمارے ہاں کارکردگی اور ایوارڈز کا آپس میں کس حد تک تعلق ہے؟

ڈاکٹر انعام الحق جاوید: ایوارڈز کا تعلق تعلق سے ہے کارکردگی سے نہیں۔ جس سے کوئی تعلق ہوتا ہے یا جس کا کوئی تعلق ہوتا ہے وہ ایوارڈ لے جاتا ہے۔ بعضوں کی کار دیکھی جاتی ہے بعضوں کی کارکردگی، تاہم جینوئین ادیبوں کو بھی بعض اوقات کوئی ایوارڈ مل جاتا ہے۔ صرف ادب میں ہی نہیں ہر معاملے میں صرف ہمارے ملک میں ہی نہیں پوری دنیا میں اور صرف آج سے ہی نہیں بلکہ ہبوط آدم سے ہی عدلیہ کے کردار سے کوئی مطمئن نہیں رہا۔ چنانچہ ادبی عدلیہ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ حتیٰ کہ نوبل ایوارڈ کے پیچھے آپ کو کئی کئی کہانیاں ملیں گی۔

ارژنگ: ادبی گروہ بندیوں کی کیا اہمیت ہے اور آپ کا تعلق کس ادبی گروہ سے ہے؟

ڈاکٹر انعام الحق جاوید: ادبی گروہ بندیوں میں بندیوں کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے بہ نسبت بندوں کے اور گروہ کے گرو کا اس میں ایک خاص کردار ہوتا ہے۔ میں ادب کے فرقہ قاسمیہ کے ندیموں میں سے ہوں اور عطاء الحق قاسمی کے حوالے سے حق پرست گروپ سے تعلق رکھتا ہوں۔

ارژنگ: ملکی و بین الاقوامی مشاعرے ادب کی ترویج میں کیا کردار ادا کر رہے ہیں؟

ڈاکٹر انعام الحق: بہت مثبت کردار ادا کر رہے ہیں۔ شاعروں اور مشاعروں کا آپس میں بڑا گہرا تعلق ہے۔ مشاعروں کی وجہ سے شاعروں میں مسابقت اور شاعری میں جدت ہے۔ ان اکھاڑوں میں اتر کر پہلوانان سخن اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ گویا یہ مشاعرے دراصل شاعری کے مظاہرے ہیں۔

ارژنگ: ہمارے نقاد کس حد تک غیر جانبداری سے کام لیتے ہیں؟

ڈاکٹر انعام الحق جاوید: ان کے غیر جانبدار ہونے کی کوئی حد ہی نہیں ہے۔ جب چاہتے ہیں غیر جانب دار ہو جاتے ہیں اور جب چاہتے ہیں غیر ذمہ دار ہو جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں اردو ادب خاصا بدقسمت ہے ہر گروہ کا اپنا نقاد ہے۔ ہر بڑے شاعر کا اپنا اپنا نقاد ہے جو نوحہ خواں کی حیثیت سے اس کے ساتھ ساتھ رہتا ہے۔ دو تین نقاد میری نظر میں تھے جنہوں نے اپنی بڑی ساکھ بنا رکھی تھی مگر افسوس کہ وہ بھی شاعرات کے ہاتھوں مات کھا گئے۔ ہمارے نقاد بے چارے مجبور نقاد ہیں ان سے تو عربی شاعر ابونواس ہی بہتر تھا جسے خلیفہ وقت نے اپنی شاعری کے بارے رائے دینے کے لیے کہا اور سچی رائے دینے کے بدلے میں اسے جیل بھیج دیا گیا۔ جب سزا کاٹ کے واپس آیا اور خلیفہ وقت نے پھر اسے تازہ کلام سنا کر رائے چاہی تو ابونواس اٹھ کر چل پڑا خلیفہ نے پوچھا کدھر؟ ابونواس بولا "جیل اور کدھر"۔

ارژنگ: لاہور اور اسلام آباد کی ادبی فضا میں کیا فرق محسوس کرتے ہیں؟

ڈاکٹر انعام الحق جاوید: وہی جو لاہور اور اسلام آباد کی آب و ہوا میں ہے۔ لاہور کے بڑے شاعر عہد کے لحاظ سے بڑے اور اسلام آباد کے بڑے شاعر عہدے کے لحاظ سے بڑے ہیں۔

ارژنگ: آج کل کس کام میں مصروف ہیں؟

ڈاکٹر انعام الحق جاوید: آج کل علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے چھ پاکستانی زبانوں (بلوچی، براہوئی، پشتو، پنجابی، سرائیکی، سندھی) میں ایم فل پاکستانی زبانیں کے کورس کے اجرا میں مصروف ہوں۔ خیال ہے کہ اس سال اگست سے یہ کورس شروع کرا دیا جائے اور اس سلسلے میں موجودہ وائس چانسلر ڈاکٹر انوار حسین صدیقی خود بہت دلچسپی لے رہے ہیں۔ تاہم خاصا کٹھن مرحلہ ہے اور آج کل ہمارے شعبے کی پوری ٹیم دن رات اس کٹھن مرحلے کو سر کرنے میں مصروف ہے۔ قومی یکجہتی کے فروغ اور کثیر اللسانی ماہرین کی کمی پوری کرنے کے لیے یہ کورس یقیناً ایک سنگ میل ثابت ہوگا اور اسی لیے آج کل میری ساری توجہ اس طرف ہے۔

ارژنگ: روداد نکالنے کا خیال کیسے آیا؟

ڈاکٹر انعام الحق جاوید: بس بیٹھے بیٹھے دسمبر ۱۹۹۹ء میں جنون سوار ہوا اور جنوری ۲۰۰۰ء میں پہلا شمارہ نکال باہر کیا۔ ایک سال تک تو یہ سلسلہ ریگولر چلتا رہا مگر اب دیگر مصروفیات نے اس میں تعطل میں ڈال دیا ہے۔

ارژنگ: اب تک کے تخلیقی سفر سے مطمئن ہیں؟

ڈاکٹر انعام الحق جاوید: اللہ کا شکر ہے جس نے لفظوں کو برکت دی اور ان میں تاثیر کی قوت پیدا کی

بزمِ فروغِ ادب ساہیوال کے زیرِ اہتمام ضلع کونسل ہال میں معروف شاعر حسن عباسی کے تین شعری مجموعوں کی تقریبِ پذیرائی و محفلِ مشاعرہ

اظہارِ خیال بائیں سے دائیں۔ سیّد ریاض حسین زیدی، نجیب احمد، باقی احمد پوری، عدیل برکی، حافظ مظفر محسن، پروفیسر ارجمند قریشی، طالب جتوئی

اظہارِ خیال بائیں سے دائیں۔ پروفیسر اکرم ناصر، مرتضیٰ ساجد، فدا بخاری، مسعود اوکاڑوی، سرور جاوی، ندیم عباس اشرف

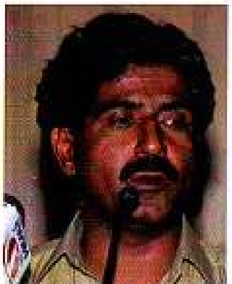

واصف سجاد

حسرت بلال

تقریب کے شرکاء

حسن عباسی اپنا کلام سناتے ہوئے

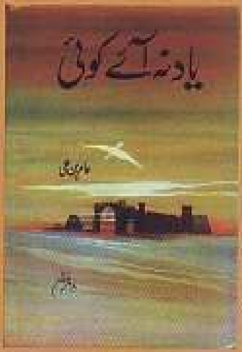

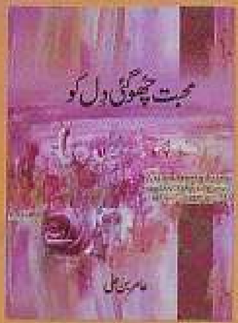

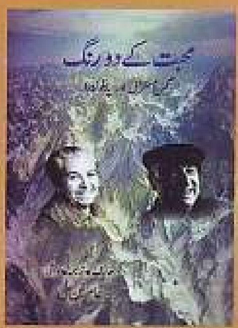

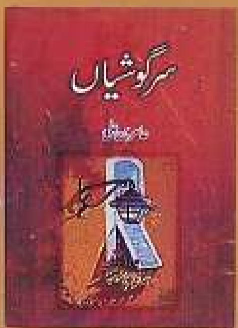

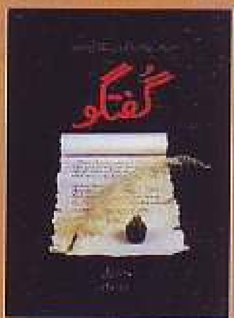

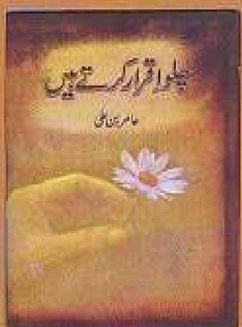

نامور شاعر، کالم نویس اور مترجم عامر بن علی کی کتب کے

تازہ ایڈیشن

شائع ہو گئے

حسن اور حکومت سے کون جیت سکتا ہے
یہ بتاؤ دونوں کی عمر کتنی ہوتی ہے

ناشر نستعلیق مطبوعات F-3 فیروز سنٹر غزنی اسٹریٹ اُردو بازار لاہور
0423-7351963 - 0300-4489310
email: nastalique786@gmail.com

Read Arxang Online
www.amirbinali.com
www.millat.com